جُہد و عمل۔۔۔۔قومی بیداری کیلئے!!!

ماہنامہ

آزاد

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

دسمبر 2013 | شمارہ نمبر: 16 | جلد نمبر: 2

فہرست

لاپتہ افراد بازیابی مارچ	اداریہ	2
اس عہد کا یسوع مسیح	امر جیت بلوچ	3
آبلہ پاء لانگ مارچ!	منظور عزت بلوچ	5
قومی سیاسی ثقافتی اور جغرافیائی آزادی.....	ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ (انٹرویو)	7
جب جلیل ریکی کو اٹھایا گیا تو.....	ماما قدیر بلوچ (انٹرویو)	12
آجوئی مارچ اور پاکستان حلقے	علی شیر بلوچ	19
مارکسی انفرادی دہشت گردی.....	لیون ٹراٹسکی (ترجمہ: آدم پال)	21
سماجی تبدیلیاں اور بلوچ	دلشاد بلوچ	24
ہم آہنگی کے عمل کا اصول	ادارہ	29
پُھلیں سرمچار ''شہید کچکول بہار بلوچ''	چھاگلی بلوچ	30
انسانی حقوق کی چند نمایاں تحریکیں	ادارہ	32
تاریخ اور جنگ	اشفاق سلیم مرزا	37
ماما قدیر ہم منافق ہیں	Ali Khurram	42
حملہ کرنے کا اصول، ہمت سے آگے بڑھو!	برائن ٹریسی	44
پریس کانفرنس	بی ایچ آر او	46
بلوچستان میں زلزلہ اور ریاستی بربریت	پمفلٹ	47
آئینہ حقائق (تجزیہ)	ادارہ	48
اخباری بیانات	ادارہ	51

www. sagaar.net Blog : azadmagazine.wordpress.com E-mail : azadmagazine@gmail.com

اداریہ | لاپتہ افراد بازیابی مارچ

جبری گمشدگی، مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی، سیاسی کارکنوں کی ٹارگٹ کلنگ، آبادیوں پر یلغار قابض ریاستوں کا ہمیشہ ہی سے شیوہ رہا ہے لیکن جب بلوچ قومی تحریک مختلف نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی تو قابض ریاست حواس باختہ ہوکر ظلم و جبر کی حدوں کو پار کرنے لگی جو تا ہنوز جاری ہیں۔

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے مطابق 2000 سے لیکر 2013 کے آخر تک 18000 ہزار بلوچ فرزند جبری طور پر لاپتہ کئے گئے ہیں اور حراستی قتل کے شکار ہوکر 1500 افراد شہید ہو چکے ہیں۔ لاپتہ افراد کی عدم بازیابی اور حراستی قتل کے خلاف لاپتہ افراد کے لواحقین نے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے پلیٹ فارم سے گزشتہ چار سالوں سے جمہوری جدوجہد کے تمام ذرائع بروئے کار لا رہے ہیں۔ احتجاجی مظاہروں، ریلیوں، سیمیناروں، عدالتوں اور کمیشنوں میں پیشیوں کے ساتھ ساتھ طویل ترین "token hunger strike" کرتے ہوئے عالمی اداروں کی توجہ بلوچستان کی سنگین صورتحال کی جانب مبذول کرانے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ لاپتہ افراد کی عدم بازیابی کے خلاف کوئٹہ تا کراچی تاریخی لانگ مارچ کر کے ظلم و جبر اور انسانی حقوق کی پامالیوں کو دنیا کے سامنے لانے میں ایک موثر قدم اٹھاتے ہوئے تاریخ رقم کردی۔ وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے وائس چیئرمین ماما قدیر بلوچ کی سربراہی میں 27 اکتوبر کے روز کوئٹہ سے کراچی تک لانگ مارچ کی ابتداء کی گئی۔ لانگ مارچ کے شرکاء نے ہمت اور استقامت کی مثال قائم کرتے ہوئے 23 روز میں 750 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہوئے انسانی حقوق کی تنظیموں سمیت اقوام متحدہ کے کردار پر بھی کئی سوالات کھڑے کردیئے ہیں۔

ماما قدیر کی سربراہی میں لانگ مارچ تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے کوئٹہ سے کراچی کی جانب روانہ ہوئی تو راستے میں کئی مقامات پر ماما اور دیگر شرکاء کو لانگ مارچ ختم نہ کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکیاں ملنی شروع ہوگئیں لیکن قومی تحریک اور لاپتہ افراد کی بازیابی کی جدوجہد کی پاداش میں ہر قسم کے نتائج کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کا تہیہ کرنے والوں کے قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ اور انہوں نے بالآخر لانگ مارچ کو 21 نومبر کے روز اپنی منزل کراچی پریس کلب پہنچ کر اختتام پزیر ہوگیا۔

گزشتہ چار پانچ سالوں کی مسلسل جدوجہد سے ماما قدیر اپنے لخت جگر شہید جلیل ریکی کو بازیاب نہ کرا سکے لیکن ہمت و استقلال کا پیکر ثابت ہوکر لاپتہ افراد کی بازیابی کی جدوجہد میں روح رواں کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ماما قدیر کے بیٹے شہید جلیل ریکی کی مسخ شدہ لاش کی برآمدگی کے بعد بھی ماما نے کمال جراءت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاپتہ افراد کی بازیابی کیلئے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور ہزاروں مشکلات و مصیبتوں اور پاکستانی اداروں کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماما نے مسلسل جدوجہد کی مثال قائم کردی ہے مگر افسوس کہ ایک غلام قوم سے وابستگی کی وجہ سے دنیا ان کی جدوجہد اور ان کے کردار کو نظر انداز کر رہی ہے۔ کیونکہ آج کی اس سامراجی ممالک کی اجارہ داری کی دنیا میں اور paid media کے معاشرے میں مظلوموں اور محکوموں کی حقیقی جدوجہد کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ''Artificial'' کردار اور لوگوں کو سامنے لایا جاتا ہے انہی وجوہات کی بنا پر ہی تو ماما قدیر اور علی حیدر کو میڈیا اور عالمی اداروں نے نظر انداز کردیا اور ملالہ یوسفزئی کو مختلف ایوارڈز سے نوازا جا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں دہری انسانی حقوق کے نعروں کے پیچھے عالمی اجارہ دار اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے برسرِ پیکار ہیں جسکی وجہ سے عالمی تنظیمیں، انسانی حقوق کا عالمی منشور اور دیگر عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں کا منشور صرف کاغذوں پر محدود ہوتا جا رہا ہے۔

اِس عہد کا یسوع مسیح

امر جیت بلوچ

ماما گلہ نہیں کرنا، حق تو یہ ہے کہ لاکھوں کی جمِ غفیر تیرے ہمراہ ہوتا مگر ماما تُو اس عہد کا یسوع ہے اور یسوع مسیحوں کے ساتھ لوگوں کا ہجوم نہیں ہمت اور ایمان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ یسوع ہمیشہ اکیلے سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں، اکیلے سب کے گناہوں کی کفارہ کے لئے صلیب پر چڑھائے جاتے ہیں، اور بلوچ کا گناہ بھی ناقابلِ معافی ہے۔۔۔ بھلا دنیا میں کس نے غلاموں کو معاف کیا ہے جو بلوچ پر دوزخ کا دروازہ کھولنے والے پاکستان بلوچ قوم کو معاف کرے، پھر بھی کم از کم دنیا داری کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں۔۔۔ انہیں پورا کرنے کے لئے مستونگ، قلات، سوراب، خضدار اور وڈھ سے کچھ نہ کچھ لوگ آپ کے کاروان کا حصہ ہوتے۔۔۔ مگر ماما آپ جانتے ہیں نا کہ۔

ماما گلہ نہیں کرنا، حق تو یہ ہے کہ لاکھوں کی جمِ غفیر تیرے ہمراہ ہوتا مگر ماماتُو اس عہد کا یسوع ہے اور یسوع مسیحوں کے ساتھ لوگوں کا ہجوم نہیں ہمت اور ایمان کا سرمایہ ہوتا ہے۔

جولوگ۔۔۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر ایک بٹن اِدھر اُدھر کرکے گوگل ارتھ میں کوئٹہ سے کراچی کا مسافت ناپنے کی مشغلے میں وقت گزاری کرتے ہیں، اُن کے پاؤں میں چھالے نہیں پڑتے۔۔۔ وہ تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔۔۔ وہ بھوک اور پیاس کی آفاقی صداقت سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔۔۔ ایسے لوگ درد کے سفر میں آپ کے ساتھ غم ڈھونے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔ محض ذاتی ترقی کو زندگی کا حاصل اور تکمیلِ حیات کا معراج سمجھتے ہوں، آس پاس انسان اور انسانیت پر شبِ غم کس طرح شمشیرِ برہنہ برسا رہی ہے، اُن کے لئے پرائی بات ہے، ایسے لوگ قوم ووطن کی درد میں جان گسل اور جان گداز راتیں غموں کی سیج پر نہیں گزارتے۔۔۔ قوم ووطن پر قیامت گزرے۔۔۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔۔۔ اُن کی زندگی گزارنے کا اپنا الگ ہی ڈنگ ہوتا ہے سب سے الگ۔۔۔ صبح فائل بغل میں دبائے گھر سے نکلے، دوپہر، سہ پہر کو پاکستانی سکہ رائج الوقت نوٹوں سے جیبیں بھر بھر کر لوٹے۔۔۔ زندگی میں خسارے کی لذت کیا ہے۔۔۔ مراعات ومفادات کی سمندر میں ذاتی ترقی نامی بجرے پر سوار اس خسارے کی نشاط آگیں لذت سے کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ انہیں وطن کا واسطہ دینا بے کار ہے۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔ نوآبادیاتی زندگی کو منشائے یزدان جان کر اِس پر آمنا وصدقنا ایمان لاچکے ہیں، اُن کے لئے آقا کی خدمت عین سعادت بن جاتی ہے، اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمزوری خدائی حکم کے انکار کی برابر ہے، اُن کی حاصلِ زندگی یہی ہے کہ ساری خدائی چُھوٹے سہی مگر آقا کے ماتھے پر ذرا سی شکن نہ آنے پائے۔ یہ لوگ فلسفۂ منصوری کے پیروکار نہیں بن سکتے ہیں۔۔۔ یہ لوگ انکار کے صعوبتوں کے لذائذ سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔۔۔ یہ سرمد۔۔۔ چی گوارا۔۔۔ بھگت سنگھ۔۔۔ راج گرو۔۔۔ جتیندر داس۔۔۔ بالاچ۔۔۔ نقیبو۔۔۔ قمبر چاکر۔۔۔ اور غلام محمد نہیں بن سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے امید ہی کیا رکھنا، مفت میں جی کا زیاں ہوگا۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔ پنجاب کی رنگین راتوں میں لاہوری گلیوں کے 'پاپ' اور 'راک' نامی تیز دھن والی موسیقی اور دخترِ مئے ناب اور روح کُش سامانوں میں کمر کمر ڈوب کر اپنی سونگھنے اور سننے کی فطری صلاحیتیں غارت کرواچکے ہیں۔۔۔ وہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مزے اُٹھانے کے قابل کہاں رہتے ہیں۔۔۔ شہداء کے بابرکت اور مقدس لہو کی لافانی اور انمول مہک اُن کے لئے ناکارہ ہے۔۔۔ دامنِ کہسار میں کھلے پھول کی خوشبو اپنی زبان میں کیا کیا کہانی سنا رہے ہیں۔۔۔ بولان وشاشان کی چوٹی، مکرانی چنال کے پتے اپنی خاموشی میں کیا کیا بتا رہے ہیں۔۔۔ بے مرادیں گوادر کی ساحل میں چین بہ جبین تلاطم خیز موجیں

آزادی کی سُر اور انقلاب کی تال میں درد کی کون کون سی گیت گا رہے ہیں۔۔۔یہ نوآبادیاتی بہروں کے لئے زائد المیعاد اور دقیانوسی شئے ہیں، جاڑک کی الہان اور ستار کی نغمگی اُن کے لئے سماعت کے قابل ہی نہیں۔(لعنت ہو غلامی پر جو انسان کو نہ صرف گونگا بلکہ بہرہ بھی بناتا ہے)

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔جامِ آقا میں غلامی کی میٹھی زہر پی کر اپنی خودی گنوا چکے ہیں، وہ سرزمین کی پکار سنا نہیں کرتے۔۔۔فرعونِ وقت کے زندانوں میں مقیّد فرزندانِ وطن کی لہورستے زخموں کا احساس نہیں کر سکتے۔۔۔چھلنی چھلنی لاشے وصولنے والی ماں کی فلک شگاف چیخیں اُن کی آرام میں خلل نہیں ڈالتے۔۔۔ڈرل مشین سینے پر چلتی ہے اور آزادی و انقلاب کے لئے تڑپتے دل کے آر پار ہوتی ہے تو دنیا کی تکلیف دہ ترین درد اُٹھتی ہے، کانوں اور ناک منہ میں پگھلائی سیسہ اُنڈیلی جاتی ہے تو اس کے مقابلے میں موت ایک کھیل معلوم ہوتی ہے۔اِس درد اور آتش کی حدت کا اندازہ غلامی درغلامی پر مُصر بے روح عصری چنو و باجو مالک و حاصل کے مریدوں کے لئے ناممکن ہے۔۔۔بالکل ناممکن ہے۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔نس نس، رگ رگ میں سطحی مراعات اور وقتی مفادات، قطرہ قطرہ خون کی روانی میں شامل کروا چکے ہیں، سانسوں کی مالائیں پاکستانی رشتے کی غلیظ ڈوری میں پرو چکے ہیں، اُن کے لئے غلامی کے تیرہ و تاریکی میں آزادی کی ٹمٹماتی چراغ کی لَو کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ہے، اُن کے لئے رات کے سناٹے میں پہاڑی جھرنے کی مدھر مدھر موسیقی محض ایک شور ہے۔۔۔غلام دیس کے چڑیوں کی چہچاہٹ، پتوں کی سرسراہٹ اور۔۔۔اور رات کے پچھلے پہروں میں غلامی کے دبیز پردوں میں پابہ زنجیر سسکتی آزادی کی قدموں کے دھیرے دھیرے چھاپ فقط وطن کے سودائیوں کے سامانِ زیست ہیں۔۔غلامی قبول کر چکی شہری بابو کب سے محبت کی اِس معاوضے سے فارغ البال ہو چکے ہیں۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔اپنی ننگ و ناموس قابض کی منڈی میں نسوار کی بھاؤ بیچ کرتن کی فربہی، زندگی کی نصب العین قرار دے چکے ہیں، اُن کے لئے فکری بالیدگی اور روح کی طہارت ایک کارِ زیاں ہے، اس سے کون سی بینک بیلنس بڑھتی ہے۔۔۔نوکری میں دو گریڈ پروموشن تھوڑی ملتی ہے۔۔۔نشاط پرستوں کی صرف سانسوں کی ڈوری ثابت و سالم رہے، روح بے شک یہ جائے وہ جائے۔کبھی واپس نہیں پلٹے۔۔۔کاروبارِ حیات میں کون سی جنجال آنی ہے۔۔۔اسے جانے دو اس کا چلے گا کاروبار۔۔۔لہٰذا کاروبار جما پیسہ کما۔۔۔پیسے پر کبھی آفت غلطی سے بھی نہیں آتی ہے، زندگی اطمینان سے گزر جاتی ہے۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔آفتاب کو محض روشنی اور حدت کا ایک ذریعہ اور سائنسی حقیقت سمجھتے ہوں تو وہ سورج کے کرنوں میں منعکس شہدا کے جلوے دیکھ نہیں پا سکتے ہیں۔ماہتاب جن کی مئے ناب راتوں کی رنگینیاں اور دخترِ انگور کی کیف و سرور بڑھاتا ہو۔۔۔وہ چاند پر چرخہ کاتنے والی بڑھیا کی پیشانی کے جریوں میں صدیوں کی ان گنت درد سے سروکار نہیں رکھتے۔

ماما آپ جانتے ہیں کہ

جولوگ۔۔۔غلبہ یزید کو سچ اور سچ کی فتح پر ترجیح دیتے ہوں تو وہ حسین کیونکر بنیں۔۔۔وہ لوگ بولان میڈیکل کے اسٹریچر پر یزیدی قوتوں کی تشدد سے بنی صورتِ لاش زنجیروں میں جکڑے اللہ نذر نہیں بنتے کہ جو نہتے ہو کر بھی سودا بازی نہیں کرتا۔۔۔وہ غلام محمد بننے کا یارا نہیں رکھتے، جو کٹ جاتا ہے۔۔۔مر جاتا ہے۔۔۔مگر جان کی امان نہیں پاتا۔۔۔ہاں جو لوگ غلامی کے غلاظت بھری کاروبار میں تن بدن کے ساتھ روح کا بھی سودا لگا چکے ہیں، وہ بلوچ وطن کی پتے پتے بُوٹے بُوٹے کے سامنے شرمسار ہیں۔وہ بولان و مولا کے شفاف پانیوں میں اپنی کریہہ شبیہہ کا نظارہ نہیں کر سکتے اور وہ لوگ یقیناً ماما سے آنکھیں ملانے کی قابل ہی نہیں رہ گئے ہیں۔۔۔ماما آپ کے ہاتھوں میں جو قدِ آدم آئینہ ہے، اس میں اچھے اچھوں کا اصلی چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے۔۔۔چھپے چھپانے کا کوئی حیلہ، کوئی وسیلہ کام نہیں آتا۔۔۔ماما آپ فرزانہ، مہلب، سمی کی ''لشکرِ جرار'' کے ساتھ نہتے ہو کر بھی یزید دوران کو شکست دے چکے ہیں۔۔۔ایٹمی طاقت پاکستان کی جملہ قوت و طاقت آپ کے ہمت اور بہادری کے سامنے ہیچ ثابت ہو چکی ہے۔۔۔بلوچ کے لبادہ اُوڑھے غداران وطن پاکستانی فوج کے رسوائے زمانہ اعلیٰ افسر جنرل حاصل خان بزنجو، جنرل ڈاکٹر مالک آج بلوچ وطن میں داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔۔۔فوجی چھاونیوں میں رہ کر بلوچ کے ننگ و ناموس کے نیلامی سے اپنے اپنے چہروں پر مَلے کالک کے تہوں پر اور دبیز کر رہے ہیں۔۔۔ماما جو تحریک آپ چلا رہے ہیں۔۔۔ماما جو مسافت دخترانِ بلوچ کے ہمراہی میں آپ نے طے کیا ہے۔۔۔یہ صدیوں کی سفر تھی۔۔۔صدیوں تک یادگار رہے گا۔۔۔صدیوں تک تاریخ اس کا حوالہ دیتے رہے گا۔

آبلہ پاء لانگ مارچ!

منظور عزت بلوچ

میرے پاس اس قبیل کے الفاظ نہیں کہ میں ایک حقیقت کو کہانی کی قالب میں بیان کروں، مظلوم انسانوں کی سب سے زیادہ سچّی کتاب کی ایک باب ''قلم'' میں یہ حقیقت درج ہے کہ ''قلم کی اور جو لکھتے ہیں ان کی قسم۔ کہ تم اپنے رب کی فضل سے دیوانے نہیں ہو، کہ سات سو میل پیدل لانگ مارچ پہ مجبور ہو چکے ہو، کچھ لوگ تم اور تمہاری پیدل لانگ مارچ پہ ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہنستے کہہ رہے ہیں بڈھا بیٹے کی غم میں اور بہن بھائی کی جدائی میں پاگل ہو چکے ہیں۔ مگر ان کو کیا معلوم کہ یہی تو وہ دیوانے اور پاگل ہیں جن کے ساتھ زمانہ چلتا ہے، تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اخلاق میں اچھے اور کردار میں سچے ہیں، مگر تم سب سے بہترین انسان وہ ہیں جن سے ہے زمانہ، وہ زمانہ سے نہیں۔ اجر اور نعمت، تاریخ تو ایسے ہی کرداروں کے لیے ہیں، جن کا اس سے پہلے کسی نے کہیں بھی کوئی نام نہیں سنا ہے۔ یہی تو حق کی نشانی ہے کہ وہ پیدا ایک جھگی میں ہوتی ہے، اور محلوں کی تکبر کو خاک میں ملا کر اور پھر اس کی خاک چھان کر اس سے ایک ایسی آزاد زندگی کا پتلا بناتا ہے اور اس مردہ قوم کی پتلے میں اپنی سنجیدگی کی روح پھونک دیتی ہے، تا کہ وہ جدوجہد کے لطف سے آشنا ہوں۔ بلوچ لانگ مارچ، بلوچ قومی سیاسی تاریخ میں ایک نایاب باب کا اضافہ ہے۔ ''سات سو میل کا پیدل سفر مذاق نہیں ہے'' فرزانہ نے کہا۔ ہمارے پاؤں میں تو ''کیچی بیگ'' میں چھالے پڑ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ میر محراب خان کی بیٹی ''اللہ ڈنی'' تو ایک شہزادی ہے، مگر جب ناموس کا مسئلہ بقاء کا سوال، اور جب تشخص کے سر پر ننگی تلوار کی دو دھاری ''وار'' ہو۔ اور فیصلہ ہو اس بات کی کہ گولیاں جیتیں گی سرکار کی یا وہ چھالے جو پاؤں سے لپٹ کر رو رہی ہیں۔ تو پھر پتھریلی زمین بھی ریشم کی طرح ملائم بن جائے گی۔ آخر ماں ہے احساس تو ہوگی۔ شروع شروع میں جب ہم نے سفر کا آغاز کیا تو میری ایک سہیلی راستہ بھر میں شغل مذاق کر رہی تھی، مگر پھر جب ان کی نظر حد نگاہ ویران سنسان سڑک کی مسافت پر پڑی تو وہ خاموش ہوگئی۔۔ پھر میں نے ہنس کر کہا کہ ''جدوجہد انسان کو کس قدر سنجیدہ بنا دیتی ہے'' راستے بھر میں دور دور خواتین بچے بوڑھے، ہمیں پہاڑوں پہ نظر آتے رہے راستے میں، ہم نے ان کو دیکھ کر ''وکٹری کا نشان بنایا، انھوں نے بھی جواب ہمیں وکٹری کے نشان کی صورت میں دیا، یہ کیا ہے؟ یہ وہ شعور کی علامت ہے جس سے صاف طور پر نظر آ رہی ہے کہ بلوچ قومی آزادی کی لہر بلوچ سماج کی جڑوں تک اتر گئی ہے۔ فرزانہ کی باتوں میں اتنی روانی اور فصاحت اور اس قدر سادگی موجود ہے کہ سچے موتی کی طرح۔ مگر سبزی منڈی میں سونے کا باؤ کوئی کیا جانے۔ اس لئے کچھ سوال ضروری ہیں کہ سات سو میل کا سفر پیدل طے کر کے کوئٹہ پریس کلب سے کراچی پریس کلب تک آنے کا بنیادی مطلب کیا ہے۔؟ ایک طویل اور پرخطر سفر اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جہاں بلوچستان میں بلوچ آزادی پسند سیاسی کارکنوں کو چن چن کر مارا اور پھینکا جا رہا ہے، ہر طرف ہو کا عالم ہے، ہر طرف ایک ویرانگی سی ویرانگی ہے، ایسے عالم میں چند پردہ دار بلوچ خواتین ایک بزرگ باپ، ایک کمسن لڑکا، فیصلہ کرتے ہیں کہ کوئٹہ تا کراچی لانگ مارچ کیا جائے گا اور پھر وہ چل پڑے جانب منزل مگر لوگ۔۔۔؟ آتے گئے۔ اور۔ جاتے گئے حالانکہ میلہ تو نہیں تھا مگر جن کو اپنی منزل تک پہنچنا تھا پہنچ گئے۔ مگر کیوں۔؟ حسین کا یہ قافلہ کربلا کیوں پہنچا؟ شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ ایک لاچار بہن اپنے لاپتہ بھائی اور ایک بوڑھا باپ اپنے شہید بیٹے کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہے ہیں، نہیں وہ دنیا کو احوال بلوچ و بلوچستان بتانا چاہتے ہیں کہ بلوچستان میں ایک ضحاک نامی شخص کی حکومت ہے۔ ضحاک نے چونکہ شیطان کے بہکاوئے میں آ کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی خاطر اپنے بوڑھے

ہمارے پیروں کے چھالے تو سب کو نظر آتے ہیں مگر ہماری روح کے آبلے تو فقط ہمیں ہی نظر آتے ہیں اور جہاں تک ہماری حد نگاہ ہے بس ایک سنجیدگی ہی سنجیدگی ہے جس نے بلوچ قومی پتلے میں اپنی روح پھونک دی ہے اس لئے کہ'' جدوجہد انسان کو سنجیدہ بنادیتی ہے

قریب المرگ باپ کو سوتے میں مار دیا تھا اس لیے اپنے باپ کی کرسی پر بیٹھتے ہی ضحاک کے دونوں بازوں سے دو سانپ نمودار ہوئے جس کو دیکھ کر ضحاک بہت پریشان ہوا تب اسی شیطان نے ایک بزرگ کی روپ میں آکر ان سے کہا ان سانپوں کے غائب ہونے کا حل یہ ہے کہ روزانہ دو انسانی دماغ کا گودا ان سانپوں کو کھلایا جائے، تو یہ سانپ غائب ہو جائیں گے، تب سے لیکر آج تک بلوچستان میں ہر روز کسی نہ کسی مقام پر مسخ شدہ لاشوں کا ملنا ایک غیر انسانی معمول بنتا چلا جارہا ہے، اب تک تقریبا سات سو کے قریب مسخ شدہ لاشیں دستیاب ہوئے ہیں، ہمیں شبہ ہی نہیں یقین ہے کہ یہ کام ضحاک اور ان کے فوج کا ہے۔ مگر میں آپ کو بتاوں کہ بلوچستان میں اب کہانیوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، یہاں تو بس ایک بھیانک حقیقت انسانی زندگیوں کے ساتھ موت کا کھیل کھیل رہا ہے، اور ان کا ماننا ہے کہ موت ہی انصاف کی علامت ہے، اس لیے تو سپریم کورٹ کے استفسار پر انھوں نے کہا کہ ''ہم اپنے ساتھیوں کے گلے کاٹنے والوں کو کیسے چھوڑ دیں۔'' یہ اظہار ایک دہائی کے نسل کشی کے بعد پہلی بار دنیا کے سماعت سے ٹکرائی ہے، پہلی بار پاکستانی خفیہ اداروں کی جانب سے سپریم کورٹ کے سامنے یہ بیان پیش کیا گیا، اب یہ پاکستان سمیت تمام دنیا کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ بلوچستان میں پیدا ہونے والی غیر انسانی صورتحال پر کس قدر سنجیدگی کا مظاہرہ کرئیں گے، فرزانہ نے تو اپنی بات کہہ دی کہ ''جدوجہد انسانوں کو سنجیدہ بنا دیتی ہے''۔ مگر پاکستان کی سب سے سنجیدہ ترین ادارہ فوج بلوچستان میں اس تاریخی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کررہی ہے جس کی توقع کوئی سنجیدہ ادارہ سے نہیں کرسکتا، جس کی وجہ سے بلوچستان میں انسانی حقوق کی پائمالی کے سوال نے پوری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کیا ہے۔ اب دنیا انتہائی خاموشی کے ساتھ مواد کی تلاش میں ہے، بلوچستان میں بھی وہی حکمت عملی اپنائی گئی جو طالبان بناتے وقت وزیرستان اور افغانستان میں کیا گیا، آج مسخ شدہ لاشوں کا موسم ہے، ریاستی سرپرستی میں بلوچستان میں موت بانٹنے والے صنعتیں قائم کیے گئے، اور ان صنعتوں کے پیداوار جب منظر عام پر آئے تو بلوچ روایاتی سادگی نے اپنے مظلومیت کے اظہار میں بھی اسی جھوٹے سخاوت کا مظاہرہ کیا، ہر مسخ شدہ لاش کو ہم نے سر آنکھوں پہ رکھا اس کا فقید المثال استقبال کیا، سلامی دی، قومی پرچم کے پوشاک میں اعزاز کے ساتھ اس عہد و پیماء کے ساتھ دفنایا کہ ساتھی تیرا یار اب تک زندہ ہے۔ کیسے چھوڑوں، دونوں جانب ایک ہی سوال دیوار کی مانند حال ہے۔ جنگ ایک منافع بخش کاروبار ہے، طفیلی ریاست ہمیشہ جنگوں کی آڑ میں توانائی کے بحرانوں کے ساتھ ساتھ ایٹمی طاقت بھی بن جاتے ہیں۔ مگر مظلوم کیا کریں، ان سے جو کہا گیا ہے کہ تشدد کے بغیر نوآبادکار کو بھگایا نہیں جاسکتا، اس نے تمہاری زمین اور وسائل پر طاقت کے بل پر قبضہ کیا ہے۔ تم بھی اس کو طاقت کے بل پر بھگاؤ، فرزانہ، ماما قدیر اور ان کا قافلہ کربلا تو یزید اور اس کے لشکر کے مقابلے میں گنتی کے اعتبار سے تو کسی حساب میں تھے ہی نہیں، مگر پھر بھی جنگ ہوا، حسین نے اپنے خاندان کے ہر فرد کو اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا، اور آخر کار انھوں نے اپنے بیٹے کو بھی مرتے دیکھا ان کا ماتھا چھوما اور اپنے بیمار نواسے کو بھی دکھا کر میدان جنگ میں اتر گیا اور پھر واپس نہیں لوٹا۔ حسین کے قافلے میں اب کوئی مرد زندہ نہ تھا ماسوائے بیمار زین العابدین کے، مگر حسین نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا اس کی گواہی اسی کے قاتلوں نے دی کہ جس سر کو ہم کاٹ کر ایک پلیٹ میں پیش کررہے ہیں یہ وہ سر ہے جس نے آخری وقت تک جھکنے کے بجائے کٹنے کو ترجیح دی اور لڑکر شہید ہوا۔ ماما قدیر حسین ابھی تک ام کلثوم اور زینب، بیٹے علی اکبر و زین العابدین کے ساتھ میدان کربلا میں خیمہ زن ہے۔ فقط یہ کہنے کے لیے کہ ''ہمارے پیروں کے چھالے تو سب کو نظر آتے ہیں مگر ہماری روح کے آبلے تو فقط ہمیں ہی نظر آتے ہیں اور جہاں تک ہماری حد نگاہ ہے بس ایک سنجیدگی ہی سنجیدگی ہے جس نے بلوچ قومی پتلے میں اپنی روح پھونک دی ہے اس لئے کہ'' جدوجہد انسان کو سنجیدہ بنا دیتی ہے''۔ فرزانہ نے کہا۔

کیا تم نے سنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

قومی سیاسی ثقافتی اور جغرافیائی آزادی چاہتے ہیں اپنی سرزمین اور اپنے وسائل پر خودمختار بننا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ

بلوچ عسکریت پسند رہنما ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے کہا ہے کہ بلوچستان سے پاکستانی فوج کا انخلاء اور بین الاقوامی ثالثین کی موجودگی میں مذاکرات بلوچ قومی مسئلہ کا پرامن و جمہوری حل ہے۔ کسی بے گناہ پنجابی کو نہیں مارا، ریاستی آلہ کار اگر بلوچ پشتون، سندھی پنجابی سمیت کوئی بھی ہوگا وہ مارا جائے گا، مستقبل کا آزاد بلوچستان سیکیولر مذہبی منافرت اور استحصال سے پاک ہوگا ہم اقوام عالم کی امداد وحمایت کے خواہاں ضرور ہیں لیکن دنیا پاکستان کے دوغلے پن کو سمجھنے سے قاصر ہے یا پھر سب کچھ سمجھنے کے باوجود مصلحت پسندی کا شکار ہے جو بلوچ قومی آزادی کی تحریک کی حمایت نہیں کررہی۔ ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے بلوچستان کی حالیہ صورتحال کے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا کہ 1948ء سے لے کر اب تک اگر صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو ریاست قبضہ گیریت اور اپنی کالونیل پاور کی پالیسیوں کو دوام دینے کیلئے شدت لارہی ہے۔ بلوچستان کی تحریک آزادی کا جو حالیہ دورانیہ ہے اس میں ریاستی دہشت گردی لوگوں کو اٹھانا اور اغوا کرنا انہیں تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کی لاشیں پھینکنے کا سلسلہ گزشتہ کئی سال سے جاری ہے اب جو نئی حکومت سامنے آئی ہے اس کو بھی پاکستانی فوج اور ایف سی استعمال کررہی ہے تاکہ بلوچ قوم کی نسل کشی میں مزید تیزی لائی جاسکے۔ ابھی جبری طور پر غائب کئے جانے والے بلوچوں کی بازیابی کے لئے کوئٹہ سے کراچی تک حالیہ لانگ مارچ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بلوچستان میں بلوچ قوم کی کس بے دردی سے نسل کشی کی جارہی ہے جس کو سلو جینو سائڈ کہتے ہیں۔ یہ صورتحال روز بروز گھمبیر ہوتی جارہی ہے اور اس کا مقصد ریاست کی جانب سے اپنی قبضہ گیریت کو دوام دینا ہے۔ بلوچستان کے زلزلہ متاثرہ علاقوں میں متاثرین کی امداد کیلئے عالمی اداروں کو دعوت دینے اور دوسری جانب متاثرین کی امداد میں مصروف امدادی اداروں پر حملوں سے متعلق سوال کے جواب میں ان کا کہنا تھا کہ بلوچستان کے زلزلہ متاثرہ ضلع آواران میں کسی بھی امدادی ادارے اور تنظیم کو ہم نے نہیں روکا البتہ جہاں تک ایف سی اور فوج کی بات ہے تو وہ تو ہیں بلوچوں کے قاتل جن کے ہاتھ بلوچوں کے خون سے رنگے ہیں وہ بلوچوں کا مدوا کرنے کیلئے نہیں بلکہ بلوچوں کو مارنے کیلئے آرہے ہیں۔ ہم نے روز اول سے ہی انٹرنیشنل کمیونٹی اور غیر سرکاری اداروں سے اپیل کی کہ وہ بلوچوں کی امداد کیلئے آگے آئیں کیونکہ ہمیں ریاست اور اس کے اداروں پر کوئی اعتبار نہیں پوری دنیا نے دیکھا کہ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کو تو ریاست نے زلزلہ متاثرہ علاقوں تک رسائی ہی نہیں دی باقی جہاں تک لوکل این جی اوز اور غیر سرکاری ادارے پہنچے ہم نے نہ صرف ان کا خیر مقدم کیا بلکہ اپنی تہیں انہیں ہر ممکن تحفظ فراہم کیا۔ باقی فوج اور ایف سی بلوچوں کے دکھوں کا مداوا کرنے یا ان کے زخموں پر مرہم رکھنے نہیں بلکہ اپنی قبضہ گیریت کو مضبوط کرنے کیلئے آئیں ہیں۔ آپ اس سے اندازہ

بلوچ قومی رہنما ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کا یہ خصوصی انٹرویو نیوز ایجنسی ''آن لائن'' بلوچستان کے بیورو چیف ارشاد مستوئی نے کیا ہے جسے ان کے شکریے کے ساتھ ماہنامہ ''آزاد'' کے قارئین کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ

لگائیں جب سے فوج آئی ہے گیشکور سے دو، تیر تیج سے پانچ مہی سے دو، مشکے سے افراد اٹھائے گئے جو تا حال لاپتہ ہیں۔اب تک درجنوں افراد لاپتہ کئے جا چکے ہیں۔متاثرین کو بھی انہوں نے نہیں چھوڑا انہیں بھی ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے جہاں تک کارکردگی کی بات ہے تو متاثر ہونے والوں کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ ہے جو آج بھی بے یارو مددگار پڑی ہیں اگر کسی کو یقین نہ ہو تو وہ خود آ کر بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔وہ آئیں اور دیکھیں کہ ریاستی ادارے یہاں متاثرین کی امداد کی آڑ میں کیا گل کھلا رہے ہیں۔بلوچ علیحدگی پسند قوتوں کے مابین اختلافات سے متعلق سوال کے جواب میں انہوں نے بلوچ آزادی پسندوں کے مابین اختلافات کے تاثر کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ بلوچستان کی آزادی کی جہد میں برسر پیکار جتنی بھی تنظیمیں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب بلوچستان کی آزادی کے ایک نکتہ پر متفق ہیں اور ان کے مابین کسی قسم کے اختلافات نہیں مجھے کہیں بھی بلوچ جنگ آزادی میں کوئی اختلاف نظر نہیں آرہا اگر کوئی کہے بھی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کا تاثر ہے کیونکہ مجھے بلوچ سرزمین کی آزادی کے نظریئے پر اختلاف نظر نہیں آرہا باقی ہر تنظیم اور آرگنائزیشن کے اپنے تنظیمی ڈھانچے ہیں آئین ومنشور ہیں ہر ایک اپنے طریقہ کار کے مطابق بلوچستان کی آزادی کے بنیادی ہدف کے حوالے سے جدوجہد میں برسرپیکار ہے۔جہاں تک آپ کا اشارہ اس جانب ہے کہ پھر کیوں بلوچ مختلف پلیٹ فارم سے اپنی آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں تو اس کیلئے یہ کہ یقیناً بلوچ مختلف پلیٹ فارم سے آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں لیکن یہ اتحاد و یکجہتی کی جانب جارہے ہیں قطع نظر اس کے کہ کون کس مسلح تنظیم اور کون کس آزادی پسند سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے قابض دشمن اور اس کے ادارے اس کو صرف اور صرف ''بلوچ'' سمجھ کر ہی ہدف بنارہے ہیں اور شہید کررہے ہیں اس کو اغواء کررہے ہیں ریاستی عقوبت خانوں میں انہیں غیر انسانی ووحشیانہ تشدد کا نشانہ بنا کر اس کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاش پھینک رہے،تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ قابض دشمن کے مجرمانہ اعمال اور ریاستی ادارے ہمیں بلوچ قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے پر مجبور کریں گے اور ہم ایک انتظامی طریقہ کار اپنائیں گے اور ہمارے درمیان کسی قسم کے کوئی اختلافات نہ ہوں البتہ میری شنید میں یہ ضرور آیا ہے کہ سوشل میڈیا میں بلوچ قومی آزادی کی تحریک سے متعلق بعض لوگوں کی جانب سے کچھ سوالات اٹھائے جارہے ہیں لیکن میں اس کے باوجود آپ لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے درمیان کسی قسم کے کوئی اختلافات نہیں البتہ انتظامی طور پر ہوسکتے ہیں ابھی پاکستان کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی کی ایک سائبر ٹیم ہے جب کوئی بھی نقطہ نظر یا اصلاحی تنقیدی پروگرام یا سوال اٹھایا جاتا ہے تو وہ اس کو اپنی ''فیک آئی ڈیز'' کے ذریعے پروپیگنڈہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پھیلاتے ہیں اس کو ہوا دینا بلوچوں میں کنفیوژن پھیلانے کے سوا کچھ بھی نہیں میرے خیال میں کچھ عرصہ پہلے خفیہ ادارے آئی ایس آئی کا ایک ایجنٹ بلوچ سرمچار دوستوں نے پکڑ لیا تھا اس نے واضح اعتراف کیا کہ سوشل میڈیا میں ہماری ایک سائبر ٹیم ہے ایک نہیں سینکڑوں کی تعداد میں وہ مختلف ''فیک آئی ڈیز'' استعمال کررہے ہیں تاکہ آپس میں بلوچوں میں اختلافات پیدا کئے جائیں اور بلوچ قومی آزادی کی تحریک ابہام کا شکار ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلوچوں کے جو حقیقی ایشوز ہیں ان میں ایسے اختلافات نہیں کہ دشمن یہ سمجھ سکے کہ ہم الگ ہیں کامن کاز پر ہم سب اکٹھے ہیں بلوچ قومی آزادی کی جنگ کا جو بنیادی نقطہ ہے اس پر ہم سب ایک ہیں۔چارٹر آف لبریشن کے مطلق جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ جہاں تک اختلاف کی بات ہے تو چارٹر آف لبریشن پر کوئی اختلافات نہیں کیونکہ وہ ایک منشور ہے اس منشور میں بلوچ قوم کی جنگ آزادی کی ہم سب حمایت کررہے ہیں بلوچستان کو ہم سب ایک فلاحی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں انصاف اور بقائے باہمی امن ہم سب کا فلسفہ ہے علم وادب کو فروغ دینا ہم سب کا موقف ہے اور بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ تمام جماعتوں کے منشور میں شامل ہے۔حیر بیار مری نے جو چارٹر آف فریڈم یا چارٹر آف لبریشن پیش کیا اس میں ایسا کچھ نہیں جس پر کوئی اختلاف کیا جائے بالکل یہی چارٹر آف فریڈم بلوچ نیشنل موومنٹ،بلوچ نیشنل فرنٹ،بلوچ ری پبلکن پارٹی سمیت تمام آزادی پسند تنظیموں کا ہے۔میرے خیال میں جو منشور ہے وہ کسی کا بھی ہو قابل قدر ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیئے ہاں باقی ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہوگا۔حیر بیار مری اور براہمدغ بگٹی کا مجھے معلوم نہیں کم سے کم مجھے اس پر کوئی اختلاف نہیں اور بلوچستان کی آزادی پسند کسی بھی جماعت کے منشور پر اختلاف بارے کوئی بھی آزادی پسند نہیں سوچ سکتا چاہے وہ بی این ایم کا منشور ہو بی آر پی کا ہو،حیر بیار مری جیسے آزادی پسند دوستوں کا ہو یا کسی

بھی اس جماعت کا جو بلوچستان کی آزادی کیلئے جدوجہد میں برسرپیکار ہے چاہے وہ سیاسی جماعت ہو یا پھر بلوچ آزادی پسند مسلح تنظیم کا ہو قابل احترام ہے۔ آزادی کے نقطہ پر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ۔بلوچستان میں تعلیمی اداروں کو تباہ کرنے اساتذہ اور پنجابی محنت کشوں کو ہدف بنانے سے متعلق سوال کے جواب میں ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے کہا کہ آپ کوئی ایک مثال ایسی دیں کہ بلوچ مزاحمت کاروں نے کسی استاد کو بلاوجہ ہدف بنایا ہو اگر خاران میں پبلک اسکول چلانے والا مظفر جمالی مارا گیا وہ تو تحریک نفاذ امن کا کارندہ اور آئی ایس آئی کے ڈیتھ اسکواڈ کا سربراہ ہے وہ پروپرائٹر ہے اگر بی ایل اے کے دوستوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ علم دوست انسان مارا گیا تو یہ تاثر غلط ہے۔ پروپرائٹر ہے چاہے وہ ٹیچر محنت کش یا کسی بھی شکل میں ہو دیکھیں اس وقت ہمارے پاس دو چوائس ہیں یا ہم خود مرجائیں یا تحریک آزادی میں ہمارے ہدف کا جو دشمن ہے اس کو ماریں میرے خیال میں جو کوئی بھی بلوچ قوم کی منزل کا دشمن ہے اور قابض ریاست اور اس کی قبضہ گیریت کا حامی ہے اس کو مارنا چاہیئے ۔چاہے وہ کسی ٹیچر، جرنلسٹ، یا مزدور اور محنت کش کی شکل میں ہو اپنے آپ کو کیموفلاج کرے، میرے خیال میں جو حریت پسند ہیں وہ اس کو ضرور ماریں گے جہاں تک تعلیمی اداروں کی بات ہے تو ہم نے متعدد بار اساتذہ کرام سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں میں آئیں اور اداروں کو بحال کریں اور فعال بنائیں ابھی زلزلہ زدہ جو علاقے ہیں ان میں بھی ہمارے دوستوں نے ذاتی طور پر کوششیں کی ہیں اور اساتذہ سے اپیل کی ہے کہ وہ ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے ان علاقوں میں تعلیمی ادارے کھولیں تاکہ بچے جو شاک میں ہیں انہیں اس ماحول سے نکالا جاسکے اور انہیں تعلیم کی جانب مائل کرتے ہوئے انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاسکے۔ جب ہمارا علم پر یقین ہو تو ہم کیسے ان اساتذہ کو ہدف بنا سکتے ہیں جو ہمارے اپنے بھائی ہیں ہم تو ان سے درخواست کررہے ہیں وہ تعلیمی اداروں کو فعال بنائیں لیکن بعض اوقات کچھ لوگ مختلف روپ دھار لیتے ہیں۔مثال کے طور پر بلوچی نیوز چینل وش کا ایک نمائندہ تھا واشک میں جو خود کو ظاہر تو صحافی کرتا تھا لیکن ٹیچر بھی تھا اور وہ پس پردہ ریاستی اداروں کیلئے مخبری کا کام کرتا تھا جب بی ایل ایف نے اس کو مارا تو ہمیں اس وقت بہت افسوس ہوا جب انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے یہ کہا گیا کہ بی ایل ایف نے صحافی کو مارا ہے لیکن یہ نہیں دیکھا گیا کہ وہ کر کیا رہا تھا۔ہم آج بھی کہتے ہیں کہ بلوچ قومی آزادی کی اس جنگ کے دوران اساتذہ ،صحافی فریق نہ بنیں، ہم علم دوست ہیں اور علم دوستی پر ہمارا یقین ہے آزادی صحافت پر بھی ہم یقین رکھتے ہیں۔ہم اظہار کی آزادی اور ایمنسٹی اور ہیومن رائٹس پر بھی یقین رکھتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہماری جنگ آزادی ایک ذمہ دار جنگ ہے ہم جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ ایک ضابطہ کے تحت لڑ رہے ہیں جو جنگ آزادی سے متعلق بین الاقوامی مسلمہ قوانین ہیں ہم ان قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی جنگ آزادی لڑ رہے ہیں اور ہماری جنگ بین الاقوامی اصولوں کی پابند ہے۔

70 کی دہائی سے مختلف جدوجہد اور عام پنجابی کو نشانہ بنانے سے متعلق سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں یہ واضح کردوں کہ ہم نے کسی بھی بے گناہ پنجابی یا مزدور کو نہیں مارا ہے البتہ جو کوئی بھی ریاستی فوج وخفیہ اداروں کے ساتھ آیا ہے خود کو مزدور، حجام، کیڈر، ٹیچر یا کسی بھی شکل میں لایا ہے مکمل تحقیقات کے بعد بلوچ مسلح تنظیموں نے اسے مارا ہے اور ماریں گے لیکن یہ کہنا ہے کہ ہم نے کسی ایسے بے گناہ پنجابی کو مارا ہے جس کا اس ریاست سے کوئی تعلق نہیں وہ پروپرائٹر نہیں تو یہ تاثر دینا درست نہیں۔آج بھی بلوچستان کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں وہاں آپ کو عام پنجابی ملے گا جہاں بلوچ آزادی پسند مسلح تنظیموں کی رٹ ہے وہ وہاں بھی کام کررہے ہیں مزدوری کررہے ہیں لیکن بلوچ حریت پسندوں نے انہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا جو بلوچ قومی آزادی کی تحریک کو کاؤنٹر کرنے کیلئے مزدور یا کسی اور شکل میں لاکر خود کو دنیا کے سامنے پیش کریں گے لہذا وہ بلوچ کیلئے قابل قبول نہیں صرف پنجابی ہی نہیں بلکہ بالکل اسی طرح بلوچ، پشتون، سندھی یا کوئی بھی کسی بھی قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ کسی شکل میں رہا ہے تو بلوچ آزادی پسندوں نے اس کو ہدف بنایا ہے اور بنائیں گے لیکن کسی عام بلوچ، پشتون، سندھی، پنجابی کو کسی بھی بلوچ آزادی پسند تنظیم نے کبھی نشانہ نہیں بنایا ہے اگر میڈیا کے دوست اس تاثر کو ابھار رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی نیک نیتی نہیں۔بلوچ تحریک کو بیرونی امداد و حمایت سے متعلق سوال کے جواب میں ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے کہا کہ جو قوتیں بلوچ آزادی پسندوں کو مٹھی بھر کہتی ہیں جو گیارہ مئی کے عام انتخابات ہیں اس

میں آپ شال سے لے کر گوادر جیونی تک دیکھ لیں کہ پورے بلوچستان میں بلوچوں نے انتخابات میں کس حد تک حصہ لیا خود ڈاکٹر مالک بلوچ یہ کہہ چکے ہیں کہ انہیں جو ووٹ ملے ہیں وہ سات سو پچاس ہیں باقی تو ڈنڈا ماری کے ووٹ ہیں اب سات سو پچاس ووٹ لینے والا وزیراعلیٰ ہے جہاں کا سٹنگ ووٹ کی تعداد بھی ساٹھ سے ستر ہزار ہے تو ایسے میں کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں وہ بلوچوں کا منتخب نمائندہ اور وزیراعلیٰ ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بلوچوں کا ریفرنڈم تھا اب فیصلہ آپ کرلیں کہ یہ مٹھی بھر ہیں یا پوری قوم ہے؟ ہمیں بلوچ قوم کے تمام طبقات کی مکمل حمایت حاصل ہے اور ہم اپنی جدوجہد کے اس حصے میں کامیاب ہو چکے ہیں کہ ہم نے اپنے معاشرے کے تمام افراد اور کلاسز کو یہ باور کرایا ہے کہ یہ پوری بلوچ قوم کی آزادی کی جنگ ہے اور وہ آزادی کی جنگ کو اپنا ایجنڈا سمجھ کر اپنا چکے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم بالکل کے اس بات کے خواہاں ہیں کہ عالمی برادری اور پوری دنیا بلوچ جنگ آزادی میں ہماری امداد و حمایت کرے ہم بھی اس دنیا کا حصہ ہیں جب ہم آزاد و خودمختار ہونگے تو بھی اس دنیا کا حصہ ہونگے دنیا ہماری نہ صرف مالی امداد کرے بلکہ ہماری اخلاقی حمایت بھی کرے لیکن ابھی تک ہمیں دنیا کی جانب سے کسی قسم کی کوئی مالی امداد نہیں ملی ہے اگر یہ تاثر دیا جارہا ہے بلوچ قومی جنگ آزادی کو کسی قسم کی بیرونی امداد حاصل ہے تو یہ بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ قبضہ گیروں کا ہمیشہ یہ وتیرہ رہا ہے کہ جب کبھی بھی کہیں جنگ آزادی شروع ہوئی ہے تو اس نے اس کو پراکسی سمجھا ہے کیونکہ پنجاب یا جو پاکستان نے کشمیر میں دراندازی کی ہے اور وہاں پر اکسی وار کو چھیڑا اسی پاکستان نے افغانستان میں اسی طرح کی وار کو چھیڑا ہے جس کے بعد واضح ہوگیا ہے پاکستان ایک ناکام ریاست ہے جس نے اس پورے خطے کو نہ صرف عدم استحکام کا شکار بنادیا ہے بلکہ پوری انسانیت کو خطرات لاحق ہیں۔ جب اس کے خلاف آزادی کی تحریک ابھرتی ہے تو قبضہ گیر اور اس کے زیر سایہ چلنے والے میڈیا پر اس منفی تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بلوچوں کی بیرونی امداد ہورہی ہے اگر بلوچ جنگ آزادی میں کہیں سے بھی کوئی امداد ہورہی ہوتی تو بارہ تیرہ سال سے جاری موجودہ جنگ کی صورتحال یکسر تبدیل ہوتی لیکن ہر بلوچ کی یہ خواہش ضرور ہے کہ دنیا میں سے کوئی اس کی امداد کرے لیکن ابھی تک کسی قسم کی امداد نہیں ہوسکی ہے جو ہم سمجھتے ہیں یا تو دنیا پاکستان کے دوغلے پن کو سمجھنے سے قاصر ہے یا پھر سمجھنے کے باوجود مصلحت پسندی اختیار کررکھی ہے بلوچ جنگ آزادی کو دنیا کی جانب سے کسی قسم کی کوئی مالی امداد حاصل نہیں ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ دنیا ہماری مالی، اخلاقی اور سفارتی سمیت ہر حوالے سے حمایت کرے گی کیونکہ اس وقت نہ صرف بلوچ قوم کی نسل کشی ہورہی ہے بلکہ ثقافت، زبان کو ملیامیٹ کیا جارہا ہے ہمارے اہل علم و دانش طبقے کی جو نسل کشی ہورہی ہے یقیناً ایک دن دنیا اس کا نوٹس لے گی اور ہم اسی تسلسل اور امید کے ساتھ اپنی جنگ جاری رکھیں گے۔

بلوچستان میں فرقہ واریت اور مذہبی جنونیت سے متعلق سوال کے جواب میں ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے کہا کہ بلوچستان میں جو فرقہ واریت کی لہر ہے وہ پنجاب سے آرہی ہے اور راولپنڈی کا حالیہ واقعہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے اور لشکر جھنگوی کی بنیاد کہاں پڑی جھنگ میں جو پنجاب کا شہر ہے اس کی تاریخ اتنی پرانی بھی نہیں کہ کسی کو یاد نہ ہو ہم سب نے اس کو پھلتے پھولتے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے اس کو پنجاب سے مکمل طور پر مالی معاونت حاصل ہے۔ حق نواز جھنگوی کے بعد اس کو لشکر جھنگوی کا نام دیا گیا اور اس کا رخ صرف بلوچستان کی جانب اس لئے موڑا گیا ہے تاکہ یہاں جو بلوچ نیشنل ازم اور بلوچ جنگ آزادی کی قومی تحریک ہے اس سے دنیا کی توجہ ہٹائی جاسکے اور اس میں ریاست کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی اور ایم آئی کے باقاعدہ لوگ ہیں جو فرقہ وارانہ دہشت گردی کو فروغ دے رہے ہیں اور اس میں یقیناً جو تھاٹ آف سکول ہے وہ بھی کارفرما ہے پاکستانی فوج اس کو باقاعدہ اسپانسر کررہی ہے۔ بلوچ بنیادی طور پر جمہوری سوچ رکھنے والی قوم ہے ہم مذہبی طور پر رواداد ہیں مستقبل میں جو آزاد و خودمختار بلوچستان ہوگا ہم اس کو مذہبی منافرت اور فرقہ واریت سے مکمل طور پاک ریاست بنائیں گے اور ہم استحصال سے پاک پرامن اور جمہوری ریاست کے حصول کیلئے جدوجہد میں برسرپیکار ہیں جو ایک سیکولر ریاست ہوگی جہاں تحریر و تقریر کی آزادی ہو، مذہبی آزادی حاصل ہوتا کہ مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر کوئی کسی کا گلہ نہ گھونٹے یہ ہماری پالیسی ہے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا مستقبل کا بلوچستان سوشلسٹ ہوگا تو اس پر ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے کہا کہ

نہیں۔۔۔!ہماری نیشنلزم اور قوم دوستی کی جدوجہد ہے بلوچ ایک سیکیولر قوم ہے اگر آپ بلوچ قوم کی تاریخ تہذیب وثقافت کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بلوچ ایک سیکیولر قوم ہے جہاں مذہبی منافرت کی کوئی گنجائش نہیں صدیوں سے جو مذہبی اقلیتیں بلوچستان میں رہ رہی ہیں ہم نہ صرف ان کے مذہب ،عقائد وجذبات بلکہ ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرتے ہیں کبھی ان سے مذہبی منافرت نہیں کی لیکن ابھی جو مظاہر (فینا مینا) ہیں یہ اسلام آباد کی پشت پناہی میں پنجاب سے آرہا ہے کیونکہ پاکستان کلچرل قوم نہیں لہذا وہ نصاب کے طور پر بچوں کے ذہنوں پر یہ سوچ مسلط تو کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ایک قوم ہے لیکن وہ بھول رہے ہیں مذہب کی بنیاد پر کوئی قوم نہیں اگر مذہب کی بنیاد پر قومیں بنتی ہیں تو پھر جتنی خلیجی ریاستیں ہیں وہ تمام السعود کی امامت میں سعودی عرب میں شامل ہوتیں لیکن کوئی نہیں ہورہی ہر ایک قوم کی اپنی تاریخ اور ثقافت ہے لہذا بلوچ قومی جنگ آزادی کو کاؤنٹر کرنے کیلئے پاکستان اور پنجاب اس فینا مینا کو بلوچستان میں اپنے خفیہ اداروں آئی ایس آئی اور ایم آئی کے ذریعے پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں مذاکرات اور بلوچستان کے مسئلہ کے پرامن حل کے حوالے سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بالکل بلوچستان کا پرامن اور جمہوری حل موجود ہے پاکستان بلوچستان سے اپنی فوج کو واپس بلالے اقوام متحدہ اور بین الاقوامی ثالث کی توسط سے پاکستان مذاکرات کی میز پر آجائے بالکل بلوچ اس کے ساتھ بیٹھ کر مذاکرات کرنے کو تیار ہیں اور بین الاقوامی ثالث کی موجودگی میں لیکن بلوچ بین الاقوامی ثالث کی موجودگی کے بغیر اور بلوچ قومی آزادی کے مطالبہ سے کم اور کسی چیز پر مذاکرات نہیں کریں گے۔ جہاں تک بلوچوں سے متعلق ناراض کی اصطلاح کا استعمال ہے تو وہ اکثر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور فوج یا پھر نام نہاد سیاسی قیادت کی جانب سے کیا جاتا ہے لیکن ہم اس کی وضاحت کردیں کہ بلوچ کسی سے ناراض نہیں اگر بلوچ کی آزادی وخود مختاری کو تسلیم کرلیا جائے تو ہم پنجاب سے بھی ناراض نہیں اس کے ساتھ ہماری سرحد ملتی ہے ہم ان کی جغرافیائی حدود کا بھی احترام کریں گے البتہ جہاں تک قومی ناراضی کی بات ہے تو ہم ایک ایسی ریاست کے خلاف قومی آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں جو بزور طاقت اور بزور شمشیر بلوچ سرزمین پر قابض ہے ہم حریت پسند ہیں اور اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں کسی قوم سے ناراض نہیں ہم اس ظالم جابر اور قابض ریاست سے چھٹکارا چاہتے ہیں ،قومی سیاسی ثقافتی اور جغرافیائی آزادی چاہتے ہیں اپنی سرزمین اور اپنے وسائل پر خودمختار بننا چاہتے ہیں۔

انسانوں کی بجائے اصولوں کو دلوں میں بساؤ اگر کوئی انسان بڑا اور عظیم بنتا ہے تو اصولوں ہی کے سہارے بنتا ہے۔اس لیئے اس انسان سے وہ اصول بلندتر ہوتے ہیں جو اسے عظمت بخشتے ہیں بس کبھی انسان کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ کی بجائے خود کو اس مقصد کے لیے وقف کرو، جو ہمیں زندگی کا شعور اور انسانیت کا مقصود بتاتا ہے۔

﴿﴿﴿ھوچی منہ﴾﴾﴾

جب جلیل ریکی کو اٹھایا گیا تو میں نے اپنا غم دیکھا تو سمجھ گیا کہ دوسروں کا درد زیادہ ہوگا میں نے عہد کیا کے کیوں نہ اس تنظیم کو بلوچ قوم کے لئے استعمال کروں۔۔۔۔

ماما قدیر بلوچ کا آزاد پینل کے ساتھ خاصوصی انٹرویو

سوال:1... وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی بنیاد کب اور کیوں ڈالی گئی؟

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی بنیاد اٹھائیس اکتوبر 2009 کو ڈالی گئی۔جس وقت جب ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے بچوں کو خفیہ ادارے والے اٹھانے کے بعد غائب کر رہے ہیں، تو ہم لواحقین نے یہ محسوس کیا کہ کیوں نہ ہم لواحقین مل کر ایک پلیٹ فارم سے ایسی جدوجہد شروع کریں۔اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ہم لوگوں نے ایک میٹنگ رکھی۔ایم پی اے ہاسٹل کوئٹہ میں تمام لواحقین کو دعوت دیا اور بلایا جس میں دوسو سے زائد لواحقین ہمارے ساتھ شریک ہوئے اور وہاں بیٹھ کے ہم نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہم لواحقین لاپتہ افراد کیلئے جدوجہد شروع کریں، تو سب نے بیک آواز ہو کے کہا کہ صحیح ہے۔جب نام رکھنے کی بات آئی تو اس میں ذاکر کا چھوٹا بھائی، ڈاکٹر دین محمد کا بڑا بھائی، میں، نصراللہ بلوچ، یاسین بلوچ جس کا بھائی مجیب اس وقت لاپتہ تھے اور بہت سے لواحقین ، نے فیصلہ کیا، جس میں مختلف نام زیرغور آئے، لیکن اتفاق ہوا وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے نام پر۔پھر اسکے عہدہ دار چنے گئے جس میں نصراللہ بلوچ چیئرمین اور مجھے انھوں نے وائس چیئرمین کی ذمہ داری دی۔اس زمانے میں باقی لوگ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ایک سکریٹری اطلاعات منتخب کیا گیا اور اسکے بعد ہر ضلع میں ہم نے ایک ایک ترجمان منتخب کیا۔ وہ لواحقین صرف جن کے لوگ لاپتہ ہو چکے تھے، جیسے خضدار میں رحیم بلوچ، نال میں یاسین بلوچ مستونگ میں فقیر عاجز اسکے علاوہ مکران، کوہلو سمیت ہر جگہ ہم نے نمائندے منتخب کئے، کہ وہ لوگ وہاں کام کریں گے اور جس کو بھی اُٹھایا جائے گا یا شہید کیا جائے گا اس کے مکمل تفصیلات وہ ہمیں مہیا کریں گے۔یہ سلسلہ ہمارا جاری رہا، اور اس طرح ہماری یہ تنظیم وجود میں آئی۔

سوال : 2.جب وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی بیناد رکھی گئی ،اور اس احتجاجی عمل کو شروع کیا گیا، تو کیا تب دوسری بلوچ تنظیموں اور پارٹیوں کی مدد آپ کی تنظیم کو حاصل تھی ؟

جواب: زیادہ تر پارٹیوں کی مدد اور کمک ہمارے ساتھ نہیں رہا ہے، البتہ بی ایس او آزاد اور بی این ایم کی مدد اور کمک ہمارے ساتھ رہا ہے۔باقی کسی پارٹی سے نا ہم نے مدد لی اور نہ ہی ہم نے کسی اور پارٹی کو اپنے تنظیم میں کسی قسم کی مداخلت کرنے دیا، گوکہ ہمیں بہت سے لوگوں نے کہا، مدد کرنے کوشش کی بلکہ مداخلت کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ہم نے اُن کو منع کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تنظیم غیر سیاسی تنظیم ہے اور اس کو ہم کسی بھی طرح کی سیاست میں شامل کرنا نہیں چاہتے۔بہت سے پارٹیوں نے ہمیں شمولیت کا دعوت بھی دیا لیکن ہم اُن میں بھی شامل نہیں ہوئے، ہم نے انہیں کہا کہ یہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے اس کو ہم علیحدہ چلانا چاہتے ہیں اور یہ غیر سیاسی بنیادوں پر انسانی حقوق کیلئے کام کر رہا ہے تو اس کو انسانی حقوق کے لئے کام کرنے دیں ہم نے صرف بی ایس او آزاد اور بی این ایم کی کمک لی ہے اور بی ایس او آزاد اور بی این ایم کا تعاون ہمارے ساتھ ہے۔

سوال: 3 ..آپ نے اس احتجاج کو اپنے بیٹے جلیل ریکی کے خاطر شروع کیا تھا لیکن جلیل ریکی کے

> جب میرے بڑے بیٹے جلیل ریکی کو اُٹھایا گیا تو میں نے اپنا غم دیکھا تو سمجھ گیا کہ دوسروں کا غم بھی میری طرح ہوگا۔کسی کا بھائی لاپتہ ہے، کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ تو اس دکھ کو محسوس کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرا دُکھ جو اتنا زیادہ ہے تو دوسروں کا دکھ تو مجھ سے بھی زیادہ ہوگا، اسلیئے میں نے عہد کیا کہ کیوں نہ میں اس تنظیم کو پورے بلوچ قوم کیلئے استعمال کروں۔

شہادت کے بعد آپ نے اس احتجاج کو پوری قوم کی خاطر آگے لیکر گئے، آخر اس کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب: اس کی وجوہات یہ ہیں کہ جب میرے بڑے بیٹے جلیل ریکی کو اُٹھایا گیا تو میں نے اپنا غم دیکھا تو سمجھ گیا کہ دوسروں کا غم بھی میری طرح ہوگا۔ کسی کا بھائی لاپتہ ہے، کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ تو اس دکھ کو محسوس کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرا دُکھ جو اتنا زیادہ ہے تو دوسروں کا دکھ تو مجھ سے بھی زیادہ ہوگا، اسلیئے میں نے عہد کیا کہ کیوں نہ میں اس تنظیم کو پورے بلوچ قوم کیلئے استعمال کروں، بجائے اپنے خودغرضی لالچ یا مفاد کیلئے۔ اس وقت جلیل لاپتہ تھا ہمیں یہ معلوم بھی تھا کہ وہ کہاں ہے کس حال میں ہے مجھے بہت سے آفر بھی ملے کہ ایک جلیل کی رہائی کیلئے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں لیکن اس کیمپ کو اور اس احتجاج کو بند کریں میں نے اُن کو کہا کہ یہ صرف میرا ایک بیٹا ہے اسی طرح ہزاروں بلوچ جو لاپتہ ہیں سارے میرے بیٹے ہیں سارے میرے بھائی ہیں میرے ہمدرد ہیں میرے دوست ہیں میرے قریب ہیں، اس لیئے یہ محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنے اس جدوجہد اور اس کاز کو آگے بڑھایا کہ یہ صرف میں جلیل کیلئے نہیں سب کیلئے کر رہا ہوں گو کہ جلیل کی رہائی کے مجھے بہت سے آفر ملے تھے۔

جس دن یہ تنظیم بنا ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ جس کا بیٹا بازیاب ہوگیا یا جس کا بیٹا شہید ہوگیا اس کو یہ کام آگے چلانا ہوگا، تو اس عہد کو بھی ہم آگے لے کے چلے تب ایک حلف اٹھایا تھا اس حلف کے تحت اس کام کو آگے لے کر گیا اور آج تک اللہ کی مہربانی سے یہ چل رہا ہے۔

سوال 4..... وی، بی، ایم، پی کی احتجاج سے اب تک کتنے بلوچ مسنگ پرسنز بازیاب ہوئے ھیں ؟

جواب: لاپتہ بلوچ جو بازیاب ابھی تک ہوئے ہیں اتنے نہیں ہیں شروع شروع میں جن کو اٹھایا جاتا تھا مشرف کے دور میں تو اس وقت اس دور میں چند لوگ بازیاب ہوگئے تھے ۔ان سے ہم باقی لوگوں کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، وہ ہمیں اطلاح دیا کرتے تھے کہ ہاں جلیل اس وقت زندہ تھا جلیل کو، ثناء کو، ذاکر کو، ڈاکٹر دین محمد اور دوسرے جو تھے غفار اُس وقت زندہ تھے یہ سب اکٹھے ہی تھے ۔آئی ایس آئی کے تحویل میں تھے عقوبت خانوں میں تھے اُس وقت تو ان کی اطلاح ہمیں دیا کرتے تھے تو جب مشرف کا دور ختم ہوا اور پی پی زرداری کا دور حکومت آیا اور رحمان ملک اُس وقت وزیر داخلہ بنے اُن کے آنے سے بلوچستان میں رہائی تو نا ممکن سی بات بن گئی لیکن البتہ مسخ شدہ لاشوں کا سلسلہ اس وقت زوروں پر تھا اور آج تک یہ مسخ شدہ لاشوں کا اور لاپتہ افراد کا اٹھانا ابھی تک جاری ہے۔

سوال:5 ....موجودہ حکومت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ھے؟

جواب: موجودہ حکومت ! آپ کا مطلب صوبائی یا وفاقی حکومت؟ دیکھیں صوبائی حکومت تو بہرحال بے دست و پا ہے وہ کسی کے کہنے پہ یا کسی کے پرچی پہ حکومت کرنے آیا ہے، جو کہ خفیہ ادارے ہیں انکے کہنے پہ، آپ کو یاد ہوگا کہ چند مہینے پہلے الیکشن منعقد ہوا تھا، جس میں موجودہ جو وزیر اعلیٰ ہیں، ڈاکٹر مالک اس کو 750 ووٹ ملے 750 ووٹ ملنے والا اس ملک کا وزیر اعلیٰ بن سکتا ہے تو ظاہر ہے اسے وزیر اعلیٰ تیسری قوت نے ہی بنایا ہے وہ بے دست و پا ہے، تو اس حالت سے بہت دور ہے۔ جب شروع شروع میں الیکشن ہوئے تو الیکشن کے دوران تو وہ کہتا تھا کہ میں مسخ شدہ لاشوں کا اور لاپتہ افراد کا مسئلہ حل کرونگا جب الیکشن ہوگئے وزیر اعلیٰ بن گئے تو کیمپ آئے مجھے کہا کہ میں کوشش کرونگا کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ حل کروں یا مسخ شدہ لاشوں کا گرانا کم ہو لیکن ان کے کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں کو لاپتہ کرنے میں تیزی آئی اور مسخ شدہ لاشوں کے گرانے میں تیزی آئی کمی نہیں۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد انہوں نے کراچی پریس کلب میں پریس کانفرنس کیا کہ میں بے بس ہوں میں کچھ نہیں کرسکتا لاپتہ افراد کے بارے میں میں بلکل بے دست و پا ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو بری الذمہ ٹھہرا یا۔ دیکھیں اس ملک میں حکومت فوجیوں کا ہے چاہے وفاقی ہو یا صوبائی چاہے نواز شریف کی شکل میں ہو چاہے زرداری کی شکل میں یا پھر گیلانی کی جس کسی کی بھی شکل میں ہو وفاقی حکومت کچھ نہیں کرسکتا تو اس لیے ہم ان سے مایوس ہیں۔

سوال :6۔ ڈاکٹر مالک کا کھنا ھے احتجاج جمھوری عمل ھے مگر ماماقدیر کالا نگ مارچ وقتی ھے آپ اس بارے میں کیا کھتے ھیں ؟

جواب: ڈاکٹر مالک کچھ بھی کہے ہمیں اُن سے کوئی گلہ نہیں وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں یہ وقتی ہے یا پائیدار ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس کو اچھی طرح پتہ ہے کہ چار سال سے ہم لوگ بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کے بیٹھے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کوئی چھوٹی بات نہیں ہے چار سال کوئی ایک دن نہیں بیٹھ سکتا ہم چار سالوں سے مسلسل کراچی ،کوئٹہ، اسلام آباد میں بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کے بیٹھے ہیں اور آج جو ہم نے اتنا بڑا

لانگ مارچ کیا ہے، اس کو اتنا احساس نہیں ہے کہ ہمارے پاوں میں چھالے پڑے ہیں ہمارے پاوں زخمی ہیں بہنوں اور ماوں کے اور اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ موسمی لانگ مارچ ہے ہم اس کو یہ بھی بتانا چاہتے ہیں یہ بھی دیکھانا چاہتے ہیں کہ اگر کراچی لانگ مارچ موسمی ہے تو آگے ہم اسلام آباد بھی جائیں گے تو وہ اُس کو کیا نام دیگا اُس کو موسمی مارچ کہے گا یا بیوقوف مارچ کہے گا یا کوئی اور نام دے گا ؟ اس کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے، ایک سیاست دان کو، ایک سیاسی پارٹی کے سربراہ کو یا ایک وزیراعلیٰ بلکہ نام نہاد وزیراعلیٰ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتی۔

سوال 7 ..... پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوھدری جو خود ایک بڑی جدوجھد سے گزرے ھیں، اس دوران انھوں نے بھت سے دعوے کیئے تھے ،اور مسنگ پرسنز کیس کے بارے میں کافی سرگرم دکھائی دیتے ھیں ، وہ اس سلسلے میں کئی دفعہ کوئٹہ بھی آئے جھاں انھوں نے ریاستی اداروں کے مختلف فورسز کے سربراھاں کو کورٹ تک میں بلایا، تو کیا اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ھوئی؟

جواب: جی ہاں اُس وقت کورٹ میں ہمارے لاپتہ افراد کے 91 پیشیاں ہوئیں، کوئٹہ اور اسلام آباد میں جس میں ہمارے نمائندے اور لاپتہ افراد کے لواحقین پیش ہوئے تھے اور کوئٹہ میں سپریم کورٹ میں تقریباً چار پانچ سو لاپتہ افراد کے لواحقین بھی پیشی میں حاضر ہوئے جن میں بچے ،خواتین ، بوڑھے جوان بلوچستان کے مختلف علاقوں سے پیشی میں حاضر ہوئے ۔لیکن یہ ایک دکھاوا تھا، حالانکہ ہم نے اس بارے میں کوئی درخواست نہیں دی تھی، اُس نے خود سوموٹو نوٹس لیا تھا۔ سوموٹو نوٹس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود اس چیز کو کر رہے ہیں لے جارے ہیں تو یہ ایک دکھاوا تھا کیونکہ ہماری آواز بین القوامی سطح تک پہنچ چکی تھی ،قوام متحدہ تک ہماری رسائی ہوچکی تھی، یورپی یونین تک یہ باتیں جا چکی تھی، ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اپنے رپورٹ میں لاپتہ افراد کا ذکر کیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی رپورٹیں آئی تھیں۔ اس لیے اُن پر زیادہ دباو تھا، پاکستان کو اس عالمی بدنامی کا کوئی نا کوئی حل نکالنا تھا ،کیونکہ جنیوا کنونشن کے مطابق وہ مجرم ثابت ہورہے تھے، تو انہوں نے سپریم کورٹ کو کہا کہ آپ سوموٹو نوٹس لیں اور مسنگ پرسنز کی بات کریں تا کہ ہم دنیا کو یہ دیکھائیں کہ ہم تو مجبور ہیں ہم کیا کریں دیکھو نہ اعلیٰ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ جب وہاں سے جنیوا کنونشن کے مطابق عمل کریں گے۔ جو یہ چیف جسٹس چیختا تھا یہ ایک دکھاوا تھا یہ چیف جسٹس اُس وقت صدر پاکستان کو حاظر کرا سکتا ہے وزیراعظم گیلانی کو گھر بھیج سکتا ہے اگر وہ مشرف کو گھر بھیج سکتا ہے تو کیا ایجنسی کے ایک میجر کو گرفتار نہیں کرسکتا کیا اس کے اختیار میں اتنا نہیں تھا کہ وہ ایک میجر کو گرفتار کر کے دکھاتا لوگوں کو کہ میں نے ایک میجر کو گرفتار کیا لیکن اتنا بھی نہیں کرسکتا تھا لہذا یہ ایجنسیوں کا دکھاوا تھا اور وہ ایجنسیوں کے کہنے پر یہ سب کر رہا تھا۔

چیف جسٹس انہی کے اشاروں پر یہ کام کرتا تھا، ایک انتہائی افسوسناک بات میں بتاتا ہوں، چند دن پہلے کوئٹہ میں آخری پیشی ہوئی تھی، عید سے پہلے۔ وہاں ایف سی کا ایک بریگیڈیئر پیش ہوا۔ میجر جنرل آئی جی ایف سی کو سپریم کورٹ بلاتے تھے وہ آتا نہیں تھا، لیکن ایک بریگیڈیئر پیش ہوا وہ ایسی باتیں کر رہا تھا چیف جسٹس کے ساتھ، جیسے چیف جسٹس اُس کا ملازم ہو۔ چیف جسٹس کو غصہ بھی آیا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ اسکی باتیں ہم نے سنیں تو ہم حیران رہ گئے اور میں نے یہ باتیں میڈیا میں بھی کہے۔ کوئٹہ میں دیکھیں ایک بریگیڈیئر کا چیف جسٹس کے ساتھ رویہ کیا ہے حالانکہ چیف جسٹس کو اسے گرفتار کروانا چاہئے تھا conduct of court کے تحت۔ اگر وہاں کوئی اور وکیل ہوتا یا کوئی اور مسئلہ کھڑا ہوتا، تو چیف صاحب اسے گرفتار کرواتا اور پھانسی کا حکم بھی دے دیتا لیکن وہ ایک ایجنسی کا بندہ تھا اس لئے اُس کے سامنے وہ خاموش ہوگیا۔ اس سے بھی ہم اندازہ لگا چکے تھے کہ چیف جسٹس اس معاملے میں بلکل بے دست و پا ہے اور بے بس ہے یہ دکھاوے کیلئے اتنا شور مچاتا تھا دنیا کو بے وقوب بنانے کیلئے عالمی دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے یہ باتیں کرتا تھا حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔

سوال:8 .... پاکستانی میڈیا کے بارے میں کیا کھتے ھیں ؟

جواب: پاکستانی میڈیا تو بلکل ختم ہے پاکستانی میڈیا نے آج تک نہ ہمیں کوریج دی ہے، نہ ہمیں کوریج دے رہا ہے یا تو خوف کو وجہ سے ڈرے ہوے ہیں یا پھر وہ بھی بلوچوں کو اتنا اہمیت نہیں دے رہیں ہے، کہ بلوچوں کی آواز کہیں پہنچے ہاں البتہ بی بی سی کا مثبت کردار ہے۔ پہلے بھی جب ہم یہاں آئے بہت اچھا رہا، اسکے علاوہ کوئٹہ میں یا اسلام آباد میں بھی بی بی سی کا کردار ہمارے ساتھ بہت اچھا رہا ہے اور اس کے علاوہ وائس آف امریکہ کا کردار بھی ہمارے ساتھ بہت اچھا رہا ہے اور اس

کے علاوہ وش جو ایک نجی چینل ہے، وہ بھی ہمارے ساتھ اچھا رہا ہے ڈرا ہوا تھا ڈرتا تھا لیکن بلوچیت کا تھوڑا بہت اسکو احساس تھا وہ بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ ہم آواز ہوئے۔

سوال 9 ۔۔ لانگ مارچ میں بلوچستان سے گمشدہ بلوچوں کے کتنے خاندان آپکے ساتھ تھے؟

جواب: جب ہم کوئٹہ سے نکلے تو میرے خیال سے دوسو سے زیادہ تھے۔ پہلے مارچ میں جب کوئٹہ پریس کلب کے قریب سے نکلے تو اُس وقت سینکڑوں لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم سریاب پہنچے رات ہوچکی تھی، چونکہ ہم رات کو سفر نہیں کرسکتے تھے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے ہمارے لیے تو دوسرے دن ہم نے ان لوگوں کو کہا کہ ہم لوگوں کیلئے حالات اس طرح نہیں ہیں کہ ہم سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کو لے جائیں پھر 20 کے قریب لوگ ہمارے ساتھ آگئے۔ کیونکہ ہمارے معاشی کمزوری بھی تھی دوسری بات یہ کہ ہم جہاں بھی ٹہرتے تھے ایک بلوچی روایات کے مطابق بلوچی گھر ہوتا تھا جس میں سینکڑوں لوگوں کو وہ afford نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے کھانے کا رہنے کا مسئلہ ہوتا تھا اسی لیے ہم نے ان سب کو واپس کردیا معزرت کے ساتھ کہ ہم سب کیلئے آواز اٹھارہے ہیں ایک کیلئے نہیں آپ لوگ ساتھ ہونگے یا نہیں آپ کا آواز ہم اٹھائیں گے، تو وہ یہ بات سمجھ گئے وہ وہیں سے واپس ہوگئے اسلئے اس میں ہمارے ساتھ 20 خاندان وہاں سے آئے۔ آتے آتے ہمارے ساتھ حب چوکی اور بیلہ سے تقریباً 12 سے 15 لواحقین اور ہمارے ساتھ شامل ہوگئے تو اس طرح ہمارے ساتھ کراچی تک تقریباً 20 لواحقین شریک تھے۔

سوال : 10۔۔ بلوچ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کے چیئرپرسن بانک بی بی گل بلوچ نے لانگ مارچ کے پہلے دن پریس کانفرنس کے ذریعے اس لانگ مارچ کی حمایت کا نہ صرف اعلان کیا تھا بلکہ بی بی گل اور بی،ایچ،آر،او کی ٹیم کے آپکے ساتھ کوئٹہ سے ساتھ رہے، آپ ان کی اس عمل کو کس طرح دیکھتے ہیں۔؟

جواب: بی ایچ آر او کی چیئرپرسن نے حمایت کا اعلان کیا حمایت کرتے رہے اظہار یکجہتی کے طور پر ہمارے ساتھ کوئٹہ سے چلے اس کیلئے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔

سوال :۔ 11 ۔۔ اس لانگ مارچ کے دوران کمسن علی حیدر کے جذبے کو دیکھ کر آپ کو کیا محسوس ہوا؟

جواب: ہاں وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے، جس کو اپنے باپ کی کشش پر جوش عزم کے ساتھ ہمارے ساتھ لایا ہے۔ جو لواحقین کے طور پر لانگ مارچ میں شریک رہا وہ ایک معصوم بچہ ہے اُس نے ہمارے ساتھ 750 کلومیٹر پیدل سفر طے کیا یہ بہت ہمت والی بات ہے۔ اگر حکومت پاکستان ہو یا صوبائی حکومت ہو اُس کو احساس ہوتا کہ اس معصوم بچے کا دل نہ دکھے تو اس کے والد کو فوری منظر عام پر لایا جاتا اس کا عمر ابھی پڑھنے اور کھیلنے کھودنے کا ہے یہ نہیں کہ یہ 700 کلومیٹر اپنا ریکارڈ قائم کرے اور طویل لانگ مارچ میں شامل ہو کر اپنے والد کو ہر جگہ ڈھونڈتا پھرے۔ کہاں ڈھونڈے کے میرے والد کہاں ہے؟ جوابدہ کہاں ہیں؟ کبھی کسی پہاڑ سے پوچھے کہ میرے والد کو دیکھا ہے، کسی جنگل سے گزر کر درخت سے پوچھے کے میرا والد اس سایہ میں بیٹھا تو نہیں تھا۔ راہ چلے کسی سے پوچھے کے میرے والد کو آپ نے دیکھا تو نہیں ہے۔ ہر کوئی سر جھکائے شرم سے بیٹھا ہے اس معصوم کے سامنے کہ کاش کہ ہم آپ کے والد کو یہاں سے بچا سکتے ظالموں سے اُس کو واپس لاسکتے۔ یہ اس عمر میں طویل جدوجہد کررہے ہیں تو اس کا یہ عمل قابل تحسین ہے۔

سوال: 12 ۔ آپ کافی عرصے سے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے پلیٹ فارم سے مسنگ پرسنز کیلئے جدوجہد کررہے ہیں کیا گمشدہ افراد کے لواحقین مسلسل آپ سے رابطے میں ہیں؟

جواب۔ جس وقت ہم نے یہ تنظیم بنائی اُس وقت سے آج تک ہمارے ساتھ ہیں ۔ یہ مظاہرے ریلیاں بلکہ آپ لوگوں نے سنا بھی ہوگا کہ عید کے دن بھی ریلی نکالی گئی سارے لواحقین ہمارے ساتھ شریک تھے۔ یا VBMP کے پلیٹ فارم پر جتنے بھی مظاہرے کرتے ہیں، سارے لواحقین موجود ہوتے ہیں آپ کے سامنے ہیں جن کا لڑکا، یا بھائی گرفتار ہوتا ہے تو فوری ہم سے رابطے میں رہتا ہے کہ میرے لڑکے کو اُٹھایا گیا یا کسی کے بچے کو شہید کیا جاتا ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ رابطے میں رہتا ہے۔ جس طرح ابھی یہ مُسلم جو پنجگور میں چند مہینے پہلے اُس کو اُٹھایا گیا تھا تو اس کے لواحقین میرے گھر آئے، اس کا بائیوڈیٹا بنوایا۔ سب کچھ بتایا، اُس کے بعد ہم نے کچھ باتیں جو ہمارے اصول کے حوالے سے ہیں ہم نے بتائے، پھر F.I.R درج کروایا سب کچھ کیا تا نکہ پرسوں اُسکی مسخ شدہ لاش ملی۔ جس کو

شہید کیا جاتا ہے یا اغواء کیا جاتا ہے ان کے لواحقین ہمارے رابطے میں رہتے ہیں ۔

سوال:۔13 ۔ آپ نے لانگ مارچ کا فیصلہ خود ھی کیا تھا؟ یا پھر لواحقین اور آپ کا یہ مشترکہ فیصلہ تھا ؟

جواب۔لانگ مارچ کا فیصلہ ہم نے خود کیا ایک دفعہ اپنے ذہن میں اس کا نقشہ بنایا کہ کیوں نہ میں پیدل مارچ کر کے کراچی پریس کلب جاؤں تو اس سے پہلے میرا ایک بااعتبار دوست بلکہ ایک آرگنائزیشن کا سربراہ ہے، جس کا اگر آپ کہیں تو میں نام بھی لے سکتا ہوں BSO AZAD کے چیئرمین سے میں نے مشورہ کیا کہ میں یہ لانگ مارچ کر رہا ہوں تو کیا آپ تعاون کریں گے تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک اچھا عمل ہے اگر وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز اس کو آگے لے جانا چاہتا ہے تو ہم سے جتنا بھی تعاون ہوگا ہم کریں گے اس کے بعد میں نے جتنے بھی مسنگ پرسنز کے لواحقین کے ساتھ رابطہ کیا جس طرح ذاکر مجید کی بہن ہیں، جیسے اکبر مری کا ہے۔منیر میروانی، حمزہ بلوچ کے خاندان والوں سے مشورہ کیا انہوں نے کہا کہ ہاں ماما ہم آپ کے ساتھ ہیں، لانگ مارچ میں شریک ہونگے تو پھر ہم نے قدم آگے بڑھائے۔تو پھر ہم نے تیاری کی اور پھر پریس کانفرنس کیا۔ پریس کانفرنس میں اس کا اعلان کیا کہ ہم اس دفعہ پیدل لانگ مارچ کریں گے۔اور میں نے حکومت بلوچستان کو بھی یہ کہا کہ اگر راستے میں ہمارے لانگ مارچ کو یا ہمیں کچھ ہوا یا ہمارے لوگوں کو کچھ بھی ہوا تو اس کے ذمہ داری حکومت پاکستان بشمول صوبائی حکومت جو بھی ہے اس پہ عائد ہوگی۔اگر ہمیں کچھ ہوا تو FIR اُن کے خلاف درج کیا جائے تو اسی وجہ سے وہ ہمیں تھوڑا بہت سیکورٹی بھی راستے میں دیتے رہے اور ہماری لانگ مارچ اپنے منزل تک پہنچے میں کامیاب ہوئی۔

سوال:۔14 ۔ لانگ مارچ کے دوران حکومت پاکستان کی طرف سے آپ لوگوں کے مطالبات پورے کرنے مسنگ پرسنز کو بازیاب کرنے کی کوئی پیش کش ہوئی تھی کیا؟

جواب۔جی ہاں جب ہم حب چوکی تک پہنچے تو اس وقت تک کوئی بھی نہ تھا اُسکے بعد ہمیں ایک صاحب نے اطلاع کر دیا کہ کچھ وفاقی حکومت کے لوگ آپ لوگوں سے حب چوکی میں ملنا چاہتے ہیں۔اس معاملے میں وہ آپ لوگوں سے گفت شنید کریں گے لاپتہ افراد کے بارے میں۔میں نے کہا کہ ٹھیک ہے دیکھتے ہیں ہم بات کریں گے۔

تو دوسرے یا تیسرے دن ہمیں پھر اطلاع ملا کہ ہم معذرت چاہتے ہیں کہ ہم نہیں آسکتے ہمیں روکا گیا ہے تو ہم نے کہا، تو روکنے والوں کے نام بتادیں تو کہنے لگے کہ وہ آپ خود جانتے ہیں کہ وہ کون ہیں جو ہمیں آگے نہیں آنے دیتے۔تو ظاہر سی بات ہے کہ ایجنسی والوں نے انہیں روکا تھا کہ آپ لوگ لانگ مارچ کے مسئلے میں کوئی پیش رفت کریں گے نہ کسی سے گفت وشنید کریں گے۔ میں نے کہا کہ ہمیں تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کسی سے بات کرنے کی انہوں نے خود پیغام بھیجا تھا اور ہم نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں جس طرح بھی ہو۔لیکن نہ وہ خود آج تک آئے نہ ہی ہم سے رابطہ کیا۔

سوال:۔15 ۔ کسی حکومت نواز پارٹی کی طرف سے لانگ مارچ کے دوران آپ لوگوں کو کسی قسم کی امداد یا تعاون کیا گیا تھا؟

جواب۔نہ کسی نے تعاون یا امداد کیا نہ ہم کسی سے امداد لینے کے خواہش مند ہیں نہ ہم نے کسی کو کہا، البتہ بلوچ علاقوں سے گزرے (جہاں بلوچی روایات آج بھی بر قرار ہیں) جہاں جہاں سے ہم گزرے سینکڑوں ، ہزاروں لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوتے گئے اور جہاں ہمیں رات گزارنی ہوتی تھی وہ ہماری مہمانداری کرتے تھے، بحیثیت بلوچ، کہ آپ لوگ مارچ میں ہو اتنا طویل راستہ ہے راستے میں ہمیں پانی پلاتے تھے کبھی فروٹ دیا کرتے تھے۔کبھی اپنی طرف سے کھانے کیلئے کوئی چیز دیا کرتے تھے، اکثر لوگوں سے ہم نہیں لیتے تھے۔لیکن ہم نے سوچا لوگ اپنی مرضی سے دے رہے ہیں یا بلوچی رشتے سے تو ہم نے لے لیئے کہ یہ ایک اچھی بات ہے۔البتہ وڈھ میں ہم پہنچے تو وہاں ایک بات تھی سربراہ بی این پی سردار اختر مینگل نے ہماری خاطر تواضع کی ڈیتھ اسکواڈ سے ہماری تحفظ بھی کی وہاں سے لے کر حب چوکی تک ان کے بندے ہمارے ساتھ رہے۔ڈپٹی کمشنر خضدار اس ڈرامے میں شامل تھا، ایاز مندوخیل جس کا نام ہے وہ بھی ڈیتھ اسکواڈ کے ساتھی ہے۔ اس دوران کئی جگہوں پر سیکورٹی کو واپس بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ڈپٹی کمشنر قلات نے سیکورٹی کو روکا تو اختر مینگل خود ہمارے ساتھ چل کے 7۔6 کلومیٹر ہمارے لانگ مارچ میں شامل ہوئے۔ہمیں ذاتی سیکورٹی بھی دیا۔اور جب تک سیکورٹی ہمارے ساتھ رہی ہماری خاطر تواضع بھی کیا۔باقی کسی پارٹی نے

ہماری خاطر تواضع نہیں کی نہ کوئی امداد دیا نہ ہی اظہار یکجہتی کی۔

سوال :.16۔ راستے میں جہاں کہیں لانگ مارچ آبادی والے علاقے سے گزرتی تو بلوچ عوام کی جانب سے کیا رد عمل آپکو ملا؟ کیا لوگ جوق در جوق اس لانگ میں شریک ہوتے گئے؟

؟جواب ۔ حب ہم کوئٹہ سے نکلے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ہمارے ساتھ تھے دوسرے دن ہم مستونگ آئے مستونگ میں جو محبت جو پیار ہمیں ملا اُس کا جتنا بھی میں بیان کروں کم ہے اس کے بعد ہم آگے آئے وہ جگہ جہاں ذاکر مجید کو 8 جون 2009 کو خفیہ اداروں نے اٹھایا تھا وہاں لوگ سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوگئے تھے۔انہوں نے کہا کہ آج ان کی ہمشیرہ ہمارے ساتھ ہے تو ہم نے ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا، ایجنسیوں کے خلاف کے وہ لاپتہ افراد کو بازیاب کریں۔ مظاہرہ ان لوگوں کے کہنے پہ کیا جنہوں نے کہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ذاکر مجید کو اُٹھایا گیا تھا۔ اُس کے بعد ہم آگے بڑھے۔ میجر چوک مستونگ پر بھی سینکڑوں لوگ جمع ہوگئے تھے وہاں بھی انہوں نے بہت بڑا مظاہرہ کیا نعرے بازی کی ہماری بہت اچھی طرح خاطر تواضع کی وہاں سے 10 کلومیٹر تک وہ بھی ہمارے ساتھ لانگ مارچ میں شریک رہے خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ اور جہاں جہاں ہم لوگ گزرے بلوچوں کی محبتوں اور قربتوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی ہمیں ہمت دیا کہ آج ہم یہاں کراچی تک پہنچے پائے۔

سوال :.17۔ آپ کی تنظیم نے لانگ مارچ شروع کی تھی راستے میں کوئی رکاوٹ ہوئی تھی؟ اگر ہاں تو آپ ہمیں تفصیل سے بتائیں کہ اتنے بڑے سفر میں آپ لوگوں کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں؟

جواب۔ دیکھیں مشکلات تو پیش آتی ہیں ایک بڑے ریاست کے ساتھ آپ کا جو جھگڑا ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ اپنی گھناونی حرکتیں کریں گے اپنے ناپاک عزائم وہ ضرور دکھائیں گے۔ راستے میں پریشان بھی کرتے رہے دھمکاتے بھی رہے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے بہت سے ایسی جگہیں تھی جہاں تیس چالیس و پچاس کلومیٹر ہم چلتے تھے تو ڈیتھ اسکواڈ وہاں پہنچ جاتا تھا۔ تو اس وجہ سے وہاں پریشانی ہوتی تھی پھر ہم دوسری صبح وہی سے اپنا لانگ مارچ شروع کرتے تھے خصوصاً خضدار کے علاقے جیسے تو تک جہاں ڈیتھ اسکواڈ والوں کا گھر ہے اسکے بعد باعبانہ ہے اس کے بعد خضدار کے ان علاقوں میں ہمیں کافی پریشان کیا گیا اور کافی ڈرایا دھمکایا گیا فون کالز آتے تھے ڈرانے دھمکانے کے لئے۔ یہاں سے ہم گزرتے تھے تو اُنکی گاڑیاں ہمارے ساتھ ہوتی تھی کبھی آوازیں لگاتے تھے، آگے ایف سی کی گاڑی پہنچے آرمی کی گاڑیاں درمیان میں سرخ ڈبل ڈور گاڑی بھی ہوتی تھی۔ ان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انکی شکلیں تھیں سُوروں کی طرح، انتہائی نفرت آمیز لہجے میں جو ہماری خواتین کی طرف مختلف قسم کی آوازیں کستے تھے جو غیر اخلاقی الفاظ ہوتے تھے۔ یا جس طرح ہم آئے وندر میں ایک دن وہاں ہم رہے ہمارے ساتھ سیکورٹی تھا تو دوسرے دن بیان دیا گیا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تو ہم آگے آگے جارہے تھے خواتین پیچھے پیچھے تھے تو وہاں بھی ہمیں ہٹ کیا گیا گاڑی کے ساتھ، دوبارہ مجھے ہٹ کیا گیا میں بچ گیا دوسری طرف چھلانگ لگا کے، تیسری بار جو میرا ساتھی ریڈی چلا رہا تھا اُس کو بھی ہٹ کیا گیا وہ بھی بچ نکلا۔

سوال ..18۔ کیا فائرنگ بھی کرتے تھے؟

جواب۔ فائرنگ نہیں کی، بس اسی قسم کا آنا جانا ایجنسیاں یا ڈیتھ اسکواڈ کی گاڑیاں، ڈرانا، دھمکانا، اس طرح کی حرکتیں خوفزدہ کرنے کیلئے۔

سوال: 19. اقوام متحدہ 〈UN〉 کے بارے میں آپ کی کیا رائے ھے ؟

جواب ۔ آپ کو پتہ ہے کہ 2 سال پہلے اقوام متحدہ VBMP کی دعوت پہ پاکستان آیا پاکستان نے اس کو بہت روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے تابع نہیں ہیں، ہم ضرور آئیں گے کیونکہ ہمارا دفتر بھی یہاں ہے۔ ہمارے لوگ بھی یہاں ہیں ہم انکو دیکھنے بھی آسکتے ہیں۔ پاکستان کا دورہ کرنے بھی آسکتے ہیں آپ ہمیں نہیں روک سکتے۔ وہ آئے بھی مختلف صوبوں میں گئے وہ بلوچستان بھی آئے تو بلوچستان میں ہزاروں کی تعداد میں ہم نے جلوس نکالے جہاں ہوٹل سرینا ہوتا ہے وہاں ٹھیرے تھے۔ اور وہاں میٹنگ بھی انہوں نے بُلایا تھا۔ وہاں ہم لوگ بھی گئے پہلے انہوں نے کہا کہ ہم 15 لوگوں سے ملاقات کریں گے اور 2 گھنٹے کا ٹائم دینگے آپ کو لیکن ہم نے اس بات کو رد کر دیا اور کہا کہ ہم یہ 2 گھنٹے کی ملاقات نہیں کریں گے۔ اور 15 لوگ کیوں، ہزاروں لوگ دور دور سے آئے ہیں اُن سے آپ کو ملاقات کرنی ہے۔ ہم ہزاروں کی تعداد میں دُور دُور سے آئے ہیں ہم سارے لواحقین ہیں۔ آپ کم از کم ہمیں 7.8 گھنٹہ دے دیں اور سو (100) سے زیادہ آپ ہمارے لواحقین سے ملاقات کریں۔ تو پھر وہ مان گئے

110 لوگوں سے ہم نے اُنکی ملاقات کرائی۔ فرداً ایک ایک سے انہوں نے داستان سُنی۔ ہم نے اُن سے سات (7) گھنٹہ لے لیا ہر ایک کو تسلی سے سنا پھر ہم نے اُنکو کوائفیں بھی دیں۔ جو کہ اس وقت ہماری لاپتہ افراد کی 14 ہزار کی فہرست تھی اور ایک کتابچہ بھی دیا جن میں شہیداء کی تصویریں تھیں۔ انگلیش زبان میں پوری بائیوڈیٹا بھی دی تھیں۔

لاپتہ افراد کی کیسز عدالتوں میں چل رہی تھیں اُن کی فائلیں بھی دیں۔ اور ذاکر مجید کی بہن نے جو بھوک ہڑتالی کیمپ لگائے ہوئی تھی، اُس کے پاس جو DOCUMENTS تھے جو کٹنگ تھے اخباروں کی وہ بھی اُن کو پیش کئے۔ اور اُن سے الگ ملا بھی اور کافی تسلی بھی دی کہ انشااللہ ہم کوشش کریں گے پاکستان پر دباؤ ڈالیں گے کہ آپ کا بھائی بازیاب ہوجائے بشمول دیگر لاپتہ افراد کے لواحقین اور ہم اُن سے ابھی تک پُر امید ہیں۔ کیونکہ ایک بین القوامی قانون ہے وہ اتنی جلدی کسی ملک پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتے وہ ثبوت اکٹھا کر رہے ہیں گو کہ ابھی بھی ہمارے ساتھ اُن کا رابطہ ہے۔ جس دن کسی کو اُٹھایا جاتا ہے تو وہ ہم سے بائیوڈیٹا مانگتے ہیں جس دن کسی کو شہید کیا جاتا ہے بھی ہم سے بائیوڈیٹا مانگتے ہیں۔ اور جس طرح ہمارا انٹرنیشنل VBMP کام کر رہا ہے باہر کے ممالک میں وہ بھی وہاں کام کر رہے ہیں وہ بھی ملاقات کر رہے ہیں یورپی یونین سے UNO سے۔ اس دوران UNO نے ہمیں بُلایا بھی تھا ایک دفعہ کہ آپ آئیں ہم سے ملاقات کریں دعوت نامہ بھی بھیجا تھا لیکن یہاں پاکستان کے وزیر داخلہ جو کہ اس وقت رحمٰن ملک تھے اور اس وقت کے چوہدری نثار اس سیٹ پر ہیں، انھوں نے ہمیں کلئرنس (clearness) نہیں دی انہوں نے معذرت بھی کیا کہ آپ کی حکومت کلیئرنس نہیں دے رہا ہے لہذا ہم ویزہ نہیں دے سکتے۔ تو اِس وقت اقوام متحدہ کا رویہ یہ ہے۔ ایشین ہیومن رائٹس واچ یا ایمنسٹی انٹرنیشنل یہ ہمارے ساتھ اچھے ہیں روزانہ آتے ہیں ہمارے ساتھ اُنکا رابطہ ہے۔ یہاں بلوچستان میں جو بلوچوں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ خبر اُن کو اُسی وقت ملتا ہے تو ہم اُن کے کام سے مطمئن ہیں۔

سوال:۔ 20۔ لانگ مارچ کے دوران کوئی ایسا لمحہ پیش آیا جس سے آپ کو لگا کہ آپ اس لانگ مارچ کو منزل تک نہیں لے پائیں گے؟ یا آپ کے دل میں ایسا خیال آیا کہ اب بس، اب اور نہیں؟

جواب۔ دیکھیں جب ہم نے لانگ مارچ شروع کیا تو ہم نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو کوئی کس طرح سے بھی ہمیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے لیکن ہم اس کو پایائے تکمیل تک پہنچائیں گے۔ کوئٹہ سے کراچی تک، کراچی پریس کلب کے سامنے ہمیں ہر حال میں پہنچنا ہوگا چاہیے کوئی کسی بھی طرح کی حرکتیں کرے اور انہوں نے کئے بھی، لہذا ہم اپنے لانگ مارچ کو کامیابی سے اللہ کی مہربانی سے بلوچوں کی دُعاؤں سے اور اُنکی تعاون سے منزل مقصود تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

سوال 21۔ آپ کا اگلہ لائحہ عمل کیا ہوگا ۔۔؟

جواب۔ ہمارا اگلہ لائحہ عمل یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس لانگ مارچ کے حوالے سے ایک سیمینار کریں جسکی تاریخ ہم نے دس دسمبر اناؤنس کیا ہے جو کہ عالمی انسانی حقوق کا دن ہے جسکی مناسبت سے ہم سیمینار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہمارا جو لانگ مارچ ہے اِسے جاری رکھتے ہوئے اس تسلسل کو نہ تھوڑتے ہوئے ہم اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ ختم کریں گے اور UNO کو ایک یاداشت پیش کریں گے کہ بلوچستان میں بلوچوں کے ساتھ کیا ظلم وستم ہو رہا ہے اور کتنے لوگ لاپتہ ہیں۔ کتنوں کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں۔ اس قسم کا کوئی تاریخی یاداشت پیش کریں گے۔

سوال 22۔ آپ بلوچ عوام کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔۔۔؟

جواب۔ بلوچستان کے عوام کو پیغام تو میں بہت دینا چاہتا ہوں، لیکن اگر میں کچھ کہوں تو پھر وہ سیاسی حساب سے لیا جائے گا۔ لیکن میں تمام بلوچوں، تمام بھائی بہنوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ یہ لاپتہ افراد کا مسئلہ صرف میرا نہیں ہے، ذاکر مجید کی بہن کا نہیں ہے، رمضان کے بیٹے کا نہیں ہے۔ یہ پورے بلوچستان کا مسئلہ ہے۔ اس لئے پوری بلوچ قوم کو چاہئے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں۔ ہمارے ساتھ مل کر، ہم آواز ہوکر اِس آواز کو ہر جگہ اُجاگر کریں۔ اور ہر جگہ پہنچائیں تانکہ ہماری آواز کہیں نہ کہیں پہنچ نہیں جاتی۔

شکریہ

آجوئی مارچ اور پاکستانی حلقے

علی شیر بلوچ

یہ ظُلم و جبر اور ناانصافیوں کی بھینٹ چڑھے ان جبری گمشدہ انسانوں اور استحصال زدہ مظلوم ومحکوم اقوام کی احساس تحفظ، عزتِ نفس کی بحالی اور بنیادی انسانی حقوق کی بازیابی کا لانگ مارچ تھا، جنہیں سامراجی عزائم کے تحت طویل عرصے سے لاقانونیت، استبدادیت اور سنگینوں کا سامنا ہے۔ مسخ شدہ لاشوں کی متواتر برآمدگی اور جبری طور پر لاپتہ کئے گئے بلوچ فرزندوں کی عدم بازیابی کے خلاف عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے کے لیے ماما قدیر کی سربراہی میں وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا کوئٹہ ٹو کراچی ساڑھے سات سو کلو میٹر طویل لانگ مارچ ایک تاریخی سیاسی احتجاج ہے، جسے آجوئی مارچ کا نام دیا گیا ہے، اس پُر امن سیاسی احتجاج نے بلوچ قومی انقلابی جمہوری سیاست پر چار چاند لگا کر استعماری قوتوں اور ریاستی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا ہے، اِن پُر خطر حالات میں جہاں ہر طرف بے یقینی، بے چینی اور خوف کا سماں ہو، کسی بلوچ کا جان و مال اور عزت وغیرت محفوظ نہ ہو، ایجنسیوں کی بدماشی وغنڈا گردی عُروج پر ہو، قاتل ریاستی دستے دُندناتے پھر رہے ہوں تو ماما قدیر بلوچ کا ہر قسم کے خطرات، دھمکیوں اور جارحانہ تعاقب کو خاطر میں نہ لاکر ہر بلوچ فرزند کی مسخ شدہ لاش اور ہر لاپتہ بلوچ کو اپنا فرزند تصور کر کے تمام ممکنہ مصائب ومشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے، اپنی زندگی کو ان کے لئے وقف کرنے کا عزم لے کر کامریڈ فرزانہ مجید، سمی بلوچ، بی بی گل بلوچ، اور علی حیدر جیسے بہادر سرفروش ساتھیوں کے ہمراہ میدان کارزار کے لیے نکلنا یقیناً قابلِ رشک امر ہے۔ ماما قدیر بلوچ بزاتِ خود وہ تاریخ ساز عظیم شخصیت ٹھہرے ہیں، جن کے تاریخی کردار کا ان کے نظریاتی وفکری حریف بھی قائل ہیں اور دشمن حلقے بھی ان کے اہم تاریخی کردار کا معترف ہیں۔ دوسری طرف فرزانہ مجید نے تاریخ رقم کردی ہے، انہیں بنیادی انسانی حقوق کی دفاع کے جدوجہد میں مقام ومنزلت حاصل ہوئی ہے، وہ منفرد اور غیر معمولی ہے۔ تمام قابلِ ذکر آزادی پسند سیاسی قوتوں کی حمایت سے یہ آجوئی مارچ جہاں ایک طرف پاکستانی سفاکیت وقبضہ گیریت کے خلاف عالمی وعلاقائی سطح پر مؤثر سیاسی آواز بن کر اُبھرا، وہیں اس نے بلوچ عوام کے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑ کر انہیں مایوسیوں ودل برداشتگیوں کے اندھیروں سے نکل جانے اور قومی یکجہتی اتحاد واتفاق اشتراک عمل اور دشمن کے خلاف جہد مسلسل کا درس دیا کہ ظلم کے سامنے سرمت جُھکاؤ۔ سر جُھکانے سے ظُلم مٹنے کے بجائے مزید بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر قومی بقاء پر فناء دائمی کا امکان ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

یہ ماما قدیر بلوچ اور بانک فرزانہ مجید جیسے شخصیات کی مثالی جدوجہد کا ثمر ہے کہ سیاسی اُفق پر بیدار ہونے والے قومی شعور اور شناخت نے بلوچ سماج میں ناقابلِ یقین حد تک پیش رفت کی ہے۔ بلوچ جان چکی ہے کہ وہ اپنی سرزمین پہ اپنی مرضی کا مالک نہیں، حکم چلانے والا کوئی اور ہے۔ اور یہ بھی جان چکی ہے کہ اس زیردستی وغلامی کے وجوہات کیا ہیں۔ اس زیردستی وغلامانہ زندگی سے نکلنے کے لئے شعوری سیاسی عمل، غیر پارلیمانی جدوجہد کے زریعے اجتماعی قومی زوال کا سبب بننے والی قابض ریاستی مشینری سے مکمل گُریز از حد ضروری ہے۔ جبکہ قابض اسی قومی بیداری کا راستہ روکنے کے لئے بے ضمیر، لالچی بیمار زہن مقامی گماشتوں کو گود میں لے کر ان کی سرپرستی کرتے اور انہیں بانٹ بانٹ کی

ماما قدیر بلوچ بزاتِ خود وہ تاریخ ساز عظیم شحصیت ٹھہرے ہیں، جن کے تاریخی کردار کا ان کے نظریاتی وفکری حریف بھی قائل ہیں اور دشمن حلقے بھی ان کے اہم تاریخی کردار کا متعرف ہیں

بولیاں سکھا کر تحریک کے مسلح اور سیاسی محاز کے خلاف زہر اُگل کر اور کردار کشی کر کے بلوچ عوام میں قومی جدوجہد کی اہمیت وافادیت کو مشکوک بنا کر عوام میں تیزی سے پھیلتے ہوئے اثرات کو زائل کر کے اپنے مزموم عزائم کو کامیاب کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں زرائع ابلاغ سے گفتگوں لانگ مارچ کے حوالہ پوچھے گئے ایک سوال کے جواب پر ڈاکٹر مالک نے کہا احتجاج ہر ایک کا جمہوری حق ہے، لیکن قدیر والوں کا مارچ "وقتی مارچ" تھا۔ گویا ماما قدیر اور ساتھیوں نے مسلسل چار سالوں سے قومی سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے نہیں بلکہ عارضی اور وقتی مفادات وضروریات کے تحت اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ حقیقت میں ماما قدیر اور ساتھیوں کی تاریخی لانگ مارچ نے ڈاکٹر مالک وحاصل بزنجو دیگر پارلیمانی گماشتوں کی نیندیں اُڑادی ہیں اور وہ اس سیاسی عمل کو اپنے مذموم مقاصد کے سامنے پہاڑ جیسی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ روایتی طور پر اپنے پیش رُوحوں کی طرح وقتاً فوقتاً سرپھرے بیانات جاری کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ این پی قیادت بدنیتی اور حواس باختگی میں اقتدار سے چمٹنے کے لیے اس قسم کے تاخیری دھوں پر مبنی بیانات کا سہارا لے کر ایک طرف نام نہاد جمہوریت کا ڈھونگ رچاتے ہیں تو دوسری طرف تاریخی سیاسی اقدامات سے خائف ہوکر شدید ذہنی کوفت اور ہیجانی کیفیت

میں مبتلا ہوگئے ہیں۔مسخ شدہ لاشوں کی عدم برآمدگی سے متعلق بھی ڈاکٹر مالک وحاصل بزنجو کا بیان اُسی طرح حقیقت کے منافی اور گمراہ کن ہے۔جس طرح پاکستانی فوج وحکمران امریکی ڈرون حملوں کے حوالے اپنی عوام سے دورغ گوئی کا سہارا لیتے ہیں امریکہ پاکستانی فوج اور حکمرانوں کو ڈالرادائیگی کے عوض انہیں دوغلی روا رکھنے پر اُکساتا ہے تو پاکستانی آرمی اور اجی ایچ کیو و اکٹر مالک وحاصل بزنجو جیسے گماشتہ انتظامی نمائندوں کو بے پناہ پیسہ ومراعات سے نواز کر انہیں نوآبادیاتی روبوٹ کی طرح استعمال کرتے ہیں ۔جس طرح چوہدری نثار اور سرتاج عزیز کی ڈرون حملوں کا سلسلہ بند ہونے سے متعلق دیئے گئے بیان کی سیاہی ابھی تک خشک نھیں ہوئی تھی کہ امریکہ نے قبائلی علاقے میں دوبارہ ڈرون حملہ کردیا، بالکل اسی طرح ڈاکٹر مالک، حاصل بزنجو بھی اس کیفیت کا شکار ہوئے۔جب زرائع ابلاغ میں ان کے بیانات کی سُرخیاں چھپنے کے مراحل سے گزر رہی تھیں تو خضدار اور پنجگور سے چار لاشیں برآمد ہوئیں۔جبکہ تیسری روز 7 مہینہ سے آئی ایس آئی ڈیتھ اسکواڈ کے ہاتھوں جبری طور پر اغواء کئے گئے پنجگور گرمکان کے رہاشی نویں جماعت کے کمسن طالب علم اور بی ایس او آزاد کے کارکن مسلم امام ولد ماسٹر امام الدین کی مسخ شدہ لاش سُوراب سے برآمد ہوئی۔اوراس کے ایک دن کے وقفے کے بعد سندہ اور مقبوضہ بلوچستان بارڈر پر نذیر محمد نامی ایک شخص کی مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی۔جبکہ بارکھان، ڈیرہ بگٹی خضدار، کیچ، پنجگور، آواران دیگر علاقوں میں آپریشن، اغواء نما گرفتاریوں اور لوگوں کو ہدف بنا کر قتل کرنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی فوج امریکہ کا غلام اور حکمران عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے کمپراڈر ہیں ،جبکہ ڈاکٹر مالک، حاصل بزنجو، ثناء اللہ زہری، اسلم بزنجو اور سرفراز بگٹی جیسے نام نہاد انتظامی نمائندے غلام اور ان کے رول پر کام کرنے والے "وقتی گماشتے " (Temparay Puppets) ہیں۔جو اپنی فطری سیاسی وسماجی حیثیت سے یکسر مبّرا ہیں۔اس سے قطعاً یہ تاثر نہ لیا جائے کہ بلوچ دشمنی پر مبنی یہ پورا عمل مزکورہ صاحبان کی مرضی ومشاء کے برخلاف سرانجام پا رہا ہے، اورانہیں اس پر کوئی اختیار حاصل ھیں۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ان کی باہمی رضامندی، مشترکہ منصوبہ اور آپسی تعاون کا نتیجہ ہے، جسکے بارے میں ہم اپنے پچھلے کالموں میں متعدد بار اس کی نشاندہی کر چکے ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر مالک صاحب کم ازکم اپنی زبان کا لاج رکھ کر کب کا مستعفی ہو چکا ہوتا کہ اگر ان کی صوبائی حکومت مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی کو روکنے میں ناکام رہی تو وہ مستعفی ہوجائیں گے۔مگر ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر مالک نے کراچی پریس کلب میں درجنوں صحافیوں کے سامنے اپنی مکمل ناکامی کا اظہار کرنے کے باوجود اقتدار سے چمٹنے کا ایسا چسکا لیا ہے، کہ اب ان کی زاویہ نگاہ میں بلوچ دشمنی پر مبنی تمام تر اقدامات جائز، قانونی اور اُصولی ٹھہرتے ہیں۔پیسہ مراعات وکُرسی کے سامنے غیرت حُمیت اور ضمیر کی کوئی وقعیت نھیں۔الگ قومی تشخص کی بحالی کی کوشش محال اور آزاد قومی حیثیت سے جینے کی تمنائیں خام خیالی، خوشی فہمی اور سہانا خواب کی مانند ہیں۔دوسری طرف پاکستانی سامراجیت کے زیر اثر چلنے والی کاروباری میڈیا نے روایتی مائینڈ سیٹ کے تحت ایک بار پھر اتنی بڑی قابلِ توجہ قومی ایونٹ کو نظر انداز کردیا ارگونگ بہرہ ثابت ہوا۔لاپتہ افراد کے حوالے حامد میر جیسے ایلیٹ کلاس کے صحافیوں کی جانب ماما قدیر اور جبری طور پر اغواء افراد کے لواحقین پر اپنی تحریروں میں بظاہر ہمدردی کے جذبات، احساسِ شرمندگی و پشیمانی کے تاثرات اور سیاسی جدوجہد کے حوالے تعریفی و روصیفی سطور کی آڑ میں خفیہ اداراوں اور فوج وگماشتہ ڈیتھ اسکوڈز کو تحمیری انداز میں شرکاء کے ناموں، جگہوں اور خاندانی و سیاسی حیثیت کی نشاندہی کرنا منافقت کی انتہا بن کر سامنے آئی۔یادرہے حامد میر ہی نے گذشتہ برس بلوچستان مسئلے پر اسلام آباد میں منعقد کئے گئے ایک سیمنار میں جس مخصوص لب و لہجے سے غیر محسوس انداز میں قومی تحریک کو کُچلنے کے لئے فوج اسٹبلشمنٹ اور خُفیہ اداروں کو عظیم سیاسی استاد ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کا تعارف کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کا مشورہ دیا تھا، کہ اگر حالات (انقلابی سیاسی حالات) کو قابو میں لانا چاہتے ہو تو مکران، کوسٹل بیلٹ بالخصوص گوادر میں سرمایہ کاری اور بلوچستان بھر میں ریاستی احساسات کا تحفظ اور نفاز قائم رکھنا چاہتے ہو تو بلوچ قوم کے ہردلعزیز اور نوجوانوں کے آئیڈیل لیڈر ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ سے مزاکرات یا انہیں مارنے میں ہی عافیت ہے۔جس کے شعوری اور فطری ردعمل میں مختلف سیاسی دوستوں کی تحریروں وتقریروں کے علاوہ ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کو خود ہی حامد میر کے نام کُھلا خط لکھنے کی زحمت پیش آئی تھی۔جو ہم میں سے بیشتر کے نظروں سے گزرا تھا۔جس میں ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ نے مختلف شعوری وسیاسی احساسات کو لے کر حامد میر کی بلوچ مخالف کردار اور قومی تحریک کے خلاف ریشہ دوانیوں ومنفی سرگرمیوں پر واضح اعتراض کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی صحافتی زمہ داریوں سے انحراف، حقائق کو توڑ مروڑ کر کاغذ وقلم کے تقدس کا خیال رکھنے کا احساس دلایا تھا بہرحال ان سب باتوں سے قطع نظر وائس فار مسنگ پرسنز کے پلیٹ فارم پر بلوچ عوام کا لانگ مارچ کی شکل میں پُر امن جمہوری سیاسی احتجاج اقوام متحدہ، عالمی انسانی حقوق کے اداروں اور مہذب دنیا کا توجہ اس سنگین انسانی المیے کی طرف مبذول کرانے کا متقاضی ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید پیچیدہ اور بھیانک رُوپ اختیار کرتا جارہا ہے۔اس سے صرف نظر کے نتیجے میں نہ صرف بلوچستان بلکہ پورا خطہ عدم استحکام سے دوچار ہوتا جارہا ہے۔جو کسی بھی طرح دُنیا کے اقتصادی وسیاسی مفاد میں نہیں خطے میں امن واستحکام کے لئے ضروری ہے کہ تاریخی اقوام کے خلاف روا رکھے جانے والے سامراجی مظالم اور نوآبادیاتی و استحصالی سوچ کی بیخ کی برخلاف، ان اقوام کی تاریخی قومی حیثیت بحال کر کے بنیادی انسانی حقوق کی بازیابی اور تحفظ یقینی بنایا جائے تاکہ ہر قسم کی غیض وغضب، سفاکیت اور ناانصافی سے پاک معاشرہ تخلیق کرنے کی جانب راہ ہموار ہوسکے۔

Why Marxists Oppose Individual Terrorism?

مارکسی انفرادی دہشت گردی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

لیون ٹراٹسکی (1909)

ترجمہ: آدم پال

ہمارے طبقاتی دشمنوں کو اکثر ہماری دہشت گردی کی شکایت رہتی ہے۔ ان کا مطلب ابھی تک غیر واضح ہے۔ وہ چاہیں گے کہ پرولتاریہ کے طبقاتی دشمنوں کے مفادات کے خلاف تمام سرگرمیوں کو دہشت گردی قرار دیں۔ ان کی نظر میں ہڑتال دہشت گردی کا بنیادی طریقہ ہے۔ ہڑتال کی دھمکی، ہڑتال کی تیاری، ظالم افسر کا معاشی بائیکاٹ، اپنے درمیان کسی غدار کا اخلاقی بائیکاٹ، اس سب کو وہ دہشت گردی کہتے ہیں۔ اگر دہشت گردی کو ان معنوں میں لیا جائے جیسے کوئی بھی کام جس سے خوف پیدا ہو، یا دشمن کو نقصان پہنچایا جائے تو پھر ساری طبقاتی جنگ دہشت گردی کے سوا کچھ نہیں۔ اور جو سوال رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا بورژوا سیاستدانوں کے پاس یہ حق ہے کہ وہ پرولتاری دہشت گردی کی طرف نفرتوں کا سیلاب بہا دیں جبکہ ان کی اپنی حکومت اپنے قانون، پولیس اور فوج کے ساتھ سرمایہ دارانہ دہشت گردی کے سوا کچھ نہیں!

اگر چٹکی بھر بارود اور تھوڑا سا سیسہ ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے کافی ھے تو طبقاتی طور پر منظم ھونے کی کیا ضرورت ھے؟ اگر اعلی افسروں کو دھماکوں کے ذریعے خوفزدہ کیا جا سکتا ھے تو انقلابی پارٹی کی کیا ضرورت ھے؟ اگر کوئی بھی شخص پارلیمانی گیلری سے وزیر کا نشانہ لے سکتا ھے تو پھر جلسے، جلوس اور الیکشن کس لئے ضروری ھیں؟

لیکن یہ ضرور کہنا چاہیے کہ جب وہ ہمیں دہشت گرد کہہ کر تنقید کرتے ہیں تو وہ کوشش کر رہے ہوتے ہیں (چاہے غیر شعوری طور پر) کہ اس لفظ کو بلا واسطہ مطلب دیا جائے۔ مثال کے طور پر مزدوروں کی طرف سے مشینوں کو نقصان پہنچانا، اس لفظ کے مطابق دہشت گردی ہے۔ آجر کا قتل، فیکٹری کو آگ لگانا یا مالک کو قتل کی دھمکی، کسی وزیر کے قتل کا ارادہ صحیح معنوں میں دہشت گردی ہے۔ لیکن جو بھی عالمی سوشل ڈیموکریسی کے بارے میں علم رکھتا ہوگا وہ یہ ضرور جانتا ہوگا اس نے ہمیشہ اس قسم کی دہشت گردی کی پرزور مخالفت کی ہے۔

کیوں؟

ہڑتال کی دھمکی سے یا ہڑتال کر کے' دہشت'

پھیلانا ایسا کام ہے جو صرف صنعتی مزدور ہی کر سکتے ہیں۔ ہڑتال کی سماجی افادیت سب سے پہلے اس چیز پر منحصر ہے کہ وہ صنعت یا کمپنی کے کتنے بڑے حصے کو متاثر کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ جو مزدور اس میں حصہ لے رہے ہیں وہ کس حد تک منظم ہیں اور لڑائی کے لئے کتنے تیار ہیں۔ یہ سیاسی ہڑتال کے لئے بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ معاشی ہڑتال کے لئے۔ یہ جدوجہد کا وہ طریقہ ہے جو پرولتاریہ کے جدید معاشرے میں پیداواری کردار کی ایک کڑی ہے۔

عوام کے کردار کی اہمیت کو کم کرنا

سرمایہ داری نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک پارلیمانی سٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ پرولتاریہ کو سیاسی چالبازی میں قید نہیں رکھ سکتا، اس لئے جلد یا بدیر اسے مزدور کو پارلیمنٹ میں حصہ لینے کی اجازت دینی پڑتی ہے۔ الیکشنوں میں پرولتاریہ کا عوامی کردار اور اس کے سیاسی ارتقاء کی سطح (مقداریں جن کا تعین سماجی کردار جو کہ سب سے زیادہ پیداواری کردار سے ہوتا ہے) اپنا اظہار ڈھونڈتی ہیں۔

ہڑتال میں یا الیکشنوں میں جدوجہد کا طریقہ کار، مقصد اور نتیجہ ہمیشہ پرولتاریہ کی ایک طبقے کی حیثیت سے طاقت اور سماجی کردار پر منحصر ہوتا ہے۔ صرف مزدور ہی ہڑتال کر سکتے ہیں۔ جن کاریگروں کو کارخانے نے تباہ کر دیا ہے، وہ غریب جن کا پینے کا پانی کارخانے کی وجہ سے زہر آلود ہو رہا ہے یا لوٹ کے متلاشی ناچار لوگ مشینوں کو تباہ کر سکتے ہیں، فیکٹری کو آگ لگا سکتے ہیں یا مالک کو قتل کر سکتے

ہیں۔

صرف باشعور اور منظّم محنت کش طبقہ پارلیمنٹ میں اپنے مضبوط نمائندے بھیج سکتا ہے تا کہ وہ پرولتاریہ کے مفادات کی ترجمانی کرسکیں۔ جبکہ ایک نمایاں افسر کو قتل کرنے کے لئے اپنے ساتھ عوامی حمایت کی ضرورت نہیں۔ تباہ کن مواد بنانے کا طریقہ ہر کسی کے لئے موجود ہے اور بارود کہیں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی جدوجہد کے لئے ایک سماجی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے جس کا طریقہ کار اور وسائل موجود سماجی نظام سے حاصل کئے جاتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے طریقہ کار میں ایک میکانکی ردِعمل ہوتا ہے جو ہر معاشرے میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے، بظاہر بڑا جاذبِ نظر ہوتا ہے (قتل، دھماکے وغیرہ) لیکن جہاں تک سماجی نظام کی تبدیلی کی بات ہے تو اس کے لئے یہ بالکل بے ضرر ہوتا ہے۔

ایک ہڑتال، چاہے زیادہ بڑی نہ ہو، سماجی نتائج رکھتی ہے: محنت کشوں کی خود اعتمادی میں اضافہ کرتی ہے، ٹریڈ یونین کو بڑھوتری دیتی ہے اور پیداواری تکنیک میں بہتری لاتی ہے۔ کارخانے کے مالک کا قتل صرف پولیس کی سطح کے اثرات مرتب کرتا ہے یا مالکوں میں تبدیلی لاتا ہے جس کی کوئی سماجی افادیت نہیں۔ ایک دہشت گردانہ کوشش، چاہے 'کامیاب' ہی کیوں نہ ہو، حکمران طبقے کو پریشانی میں ڈالتی ہے یا نہیں ٹھوس سیاسی حالات پر منحصر ہے۔ لیکن کوئی بھی حالات ہوں یہ پریشانی تھوڑی مدت کے لئے ہوتی ہے؛ سرمایہ دارانہ ریاست سرکاری وزیروں کی مرہونِ منت نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ یہ ریاست جن طبقوں کی خدمت کر رہی ہوتی ہے وہ ہمیشہ نئے لوگ ڈھونڈ لیں گے، یہ نظام موجود رہے گا اور کام کرتا رہے گا۔

لیکن محنت کش طبقوں میں ان دہشت گردانہ کوششوں سے جو مایوسی پھیلتی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ایک پستول کے ساتھ مسلح ہو کر اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے تو پھر طبقاتی جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟

اگر چٹکی بھر بارود اور تھوڑا سا سیسہ ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے کافی ہے تو طبقاتی طور پر منظّم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اعلیٰ افسروں کو دھماکوں کے ذریعے خوفزدہ کیا جا سکتا ہے تو انقلابی پارٹی کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی بھی شخص پارلیمانی گیلری سے وزیر کا نشانہ لے سکتا ہے تو پھر جلسے، جلوس اور الیکشن کس لئے ضروری ہیں؟

ہماری نظروں میں انفرادی دہشت گردی کی کوئی جگہ نہیں کیونکہ یہ عوام کے شعور میں ان کے کردار کو گھٹاتا ہے، اُن کو کمزوری کا احساس دلاتا ہے اور ان کی امیدوں کو ایک بہت بڑے مسیحا کی جانب لگا دیتا ہے جو ایک دن اُن کو اُن کی مصیبتوں سے چھٹکارا دلا کر ان کا مقصد پورا کرے گا۔ عملی کام کا پراپیگنڈہ کرنے والے انارکسٹ اس بات کے لئے بے شمار دلائل دے سکتے ہیں کہ دہشت گردی کس پر زور انداز میں عوام پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نظریاتی غور اور سیاسی تجربات اس کے برعکس صورتحال پیش کرتے ہیں۔ دہشت گردی کا عمل جتنا زیادہ 'پر اثر' ہوگا، اتنا ہی وہ عوام کی اپنی تعلیم اور تنظیم میں دلچسپی کو کم کرے گا۔ جیسے ہی پریشانی کی فضا ختم ہوتی ہے، زندگی دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر چلنا شروع کر دیتی ہے، سرمایہ دارانہ استحصال کا پہیہ پھر سے گھومنے لگتا ہے، صرف پولیس تشدد زیادہ وحشی ہو جاتا ہے۔ اور نتیجے میں، امیدیں روشن ہونے اور مصنوعی طور پر ہنگامہ خیزی کی جگہ بے حسی اور مردہ دلی لے لیتی ہے۔

ردِانقلابی قوتوں کی کوششیں کہ ہڑتالیوں اور محنت کشوں کی تحریکوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے، ہر دفعہ ناکام ہوئی ہیں۔ سرمایہ دار معاشرے کو ایک متحرک اور سمجھدار پرولتاریہ کی ضرورت رہی ہے، اس لئے یہ کبھی بھی زیادہ عرصے تک پرولتاریہ کے ہاتھ پیر باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔ دوسری طرف انارکسٹوں کا 'عملی کام' کا پراپیگنڈہ ہر دفعہ یہ دکھاتا ہے کہ ریاست دہشت گرد گروپوں سے زیادہ تباہی اور بربادی پھیلا سکتی ہے۔

اگر ایسا ہی ہے تو پھر انقلاب کیسے آئے گا؟ اس صورتحال میں کیا یہ ناممکن ہے؟ بالکل نہیں۔ انقلاب صرف میکانکی وسائل کا اجتماع نہیں۔ انقلاب طبقاتی جدوجہد کے آگے بڑھنے سے آتا ہے، اور یہ صرف پرولتاریہ کے سماجی کردار کی بدولت ہی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ وسیع پیمانے پر ہڑتال، مسلح بغاوت، ریاستی اقتدار پر قبضہ، اس کا تعین ان چیزوں سے ہوتا ہے کہ پیداوار کس مرحلے پر پہنچ چکی ہے، طبقاتی طاقتوں کی صف بندی، پرولتاریہ کا سماجی وزن، اور سب سے آخر میں یہ کہ فوج کی سماجی بہتری کیا ہے کیونکہ مسلح افواج ہی وہ عنصر ہے جو انقلاب کے وقت ریاستی اقتدار کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔

سوشل ڈیموکریسی اتنی حقیقت پسند ہے کہ جو انقلاب موجودہ تاریخی حالت کے علاوہ جنم لے رہا ہے اس سے اجتناب نہ کرے بلکہ اس کے برعکس، انقلاب کو کھلی آنکھوں کے ساتھ جا کے ملے۔ لیکن (انارکسٹوں کے برعکس اور ان کے خلاف جدوجہد میں) سوشل ڈیموکریسی ان تمام طریقوں اور وسائل کو رد کرتی ہے

جو مصنوعی طور پر معاشرے کی ترقی تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور پرولتاریہ کی ناکافی قوتوں کو کیمیائی طریقوں سے مدد فراہم کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ اسے سیاسی جدوجہد کے درجے تک پہنچا دیا جائے، دہشت گردی انتقام کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسا کہ روس میں تھا، جو کہ دہشت گردی کا تاریخی وطن ہے۔ سیاسی قیدیوں پر تشدد نے ویرا زیولچ کو ابھارا کہ وہ عوامی نفرت کی نمائندگی کرتے ہوئے جنرل تریپوف پر قاتلانہ حملہ کرے۔ اس کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے انقلابی دانشوروں نے، جو پہلے ہی عوامی حمایت ڈھونڈ رہے تھے، اس کی نقل کرنا شروع کر دی۔ جو عمل بغیر سوچے ایک انتقامی عمل تھا 81-1879 میں ترقی کر کے ایک مکمل نظام بن چکا تھا۔ مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں انارکسٹ قتلوں کے پیچھے ہمیشہ حکومت کی کوئی نہ کوئی ظالمانہ کاروائی ہوتی ہے، جیسا کہ ہڑتالیوں پر گولی چلانا یا سیاسی مخالفوں کا قتل۔ دہشت گردی کا سب سے اہم نفسیاتی ماخذ انتقام کا جذبہ ہوتا ہے جو باہر نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے۔

اس نکتے پر محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ سوشل ڈیموکریسی اور ان بکاؤ اخلاقیات پسندوں میں کوئی قدر مشترک نہیں جو کسی بھی دہشت گردی کے عمل کے جواب میں انسانی زندگی کی 'قدر' کے بارے میں بیان دیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو دوسرے موقعوں پر، اسی 'قدر' کے نام (مثال کے طور پر، قومی غیرت یا حکمران کی عزت) پر لاکھوں لوگوں کو جنگ کے دوزخ میں دھکیل دیتے ہیں۔ آج ان کا ہیرو وہ وزیر ہے جو نجی ملکیت کا مقدس حق دیتا ہے، اور کل جب مزدور کا بے چین ہاتھ مٹھی بن جاتا ہے یا اسلحہ اٹھا لیتا ہے، تو وہ تشدد کی کسی بھی شکل میں اجازت دینے کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے حق میں خرافات بکتے ہیں۔

اخلاقیت پسندی کے درباری جو بھی کہیں، انتقام کے جذبے کے اپنے حقوق ہیں۔ یہ محنت کش طبقے کو وہ اخلاقی طاقت دیتا ہے جو اس دنیا میں کہیں اور سے مہیا نہیں کی جا سکتی۔ پرولتاریہ کی انتقام کی جلتی ہوئی آگ کو بجھنے نہیں دینا، بلکہ اسے بار بار بھڑکانا ہے، تاکہ اسے اور تیز کیا جا سکے، اور اسے نا انصافی اور انسانی تذلیل کے اصل محرکات کی طرف موڑا جا سکے۔۔ یہی سوشل ڈیموکریسی کا مقصد ہے۔

ہم انفرادی دہشت گردی کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کیونکہ انفرادی انتقام ہمیں تسکین نہیں پہنچاتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ ہمیں جو حساب چکتا کرنا ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ اسے ایک سرکاری ملازم جسے وزیر کہتے ہیں پورا نہیں کر سکتا۔ انسانیت کے خلاف تمام جرائم کو ہوتے ہوئے دیکھنا، وہ تمام تذلیل جو انسانی جسم اور روح کے ساتھ کی جاتی ہے، اسے موجودہ معاشرے کے اظہار کے طور پر سمجھنا اور اپنی تمام توانائیوں کو موجودہ نظام کے خلاف جدوجہد میں اکٹھے کرنا۔ یہی وہ رستہ ہے جس پر انتقام کے بھڑکتے ہوئے جذبات اپنی اعلیٰ ترین تسکین پا سکتے ہیں۔

قومی عدم اعتماد کی بقیہ جات کو رعایت دیتے ہوئے ہمیں بے حد محتاط ہونا چاہیے اور صبر سے کام لینا چاہیے۔۔۔۔۔ کیونکہ قومی عدم اعتماد۔۔۔۔ بہت سخت جان ہوتا ہے۔ جلد بازی اُسے ختم کرنیکی بجائے اس میں اضافے کا باعث ہوسکتی ہے۔ بالفاظ دیگر جلد بازی کرنے سے ہم مکمل اتحاد کے قیام کے مقصد کو خطرے میں ڈال دیں گے۔

☆☆☆ **لینن** ☆☆☆

سماجی تبدیلیاں اور بلوچ

دلشاد بلوچ

دنیا میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے سوائے تبدیلی کے ''ثابت ہے ہر تغیر کو زمانے میں'' ،اس تبدیلی کو ارتقاء کہا جاتا ہے ،ارتقاء کا مطلب ہے ترقی ،آگے بڑھنا ، پھلنا پھولنا۔اس کے مدمقابل جمود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔جمود کا مطلب ہے ایک ہی جگہ ٹھہرے رہنا یا ایک ہی دائرے میں حرکت کرنا۔دنیا میں کوئی چیز ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ہر چیز مسلسل تبدیلی کے عمل سے گذر رہی ہے۔یہ تبدیلیاں ہمیشہ ناقابلِ واپسی ہوتی ہیں۔ان ناقابلِ واپسی تبدیلیوں سے ہی وقت کا تصور ابھرتا ہے۔ارتقاء نا صرف بے جان مادے کا بلکہ زندگی کا بھی بنیادی اصول ہے۔انسانی معاشرہ بھی مسلسل بدلتی رہتی ہے اور اس ارتقاء سے اسے بھی استثنیٰ حاصل نہیں۔آگ کا استعمال سیکھنے سے پہلے کا انسان اس انسان سے بالکل مختلف تھا جس نے آگ کا استعمال سیکھا تھا۔شکار پر گذارا کرنے والا انسان اس انسان سے یکسر مختلف تھا جس نے زراعت سیکھی تھی۔آج کے صنعتی دور کا انسان زرعی سماج سے بالکل مختلف ہے۔یہ دنیا ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی جیسے کے یہ آج ہے بلکہ یہ مسلسل تبدیلیوں کے بعد یہاں تک پہنچی ہے اور ہنوز یہ تبدیلیاں جاری ہیں۔

آج بلوچ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ سماجوں کے مقابلے میں اس لیئے پسماندہ ھے کیونکہ یہاں بھی ارتقاء کے سامنے ایک رکاوٹ کھڑی ھوگئی ھے۔اور یہ رکاوٹ بلوچ سماجی ترقی کو روکنے کا باعث بنی ھوئی ھے

ایک تبدیلی دوسری تبدیلیوں کو جنم دیتی ہے۔ایک نسل اپنے تجربات کو آئندہ نسل کو منتقل کر کے ارتقاء کے عمل کو جاری رکھنے کا باعث بنتی ہے۔پتھر اور لکڑی کے پہیے کو پختہ سڑک کی ضرورت نہیں تھی ،جب ربڑ کے پہیے آئے تو پختہ سڑک کی ضرورت پیش آئی۔پختہ سڑک سے پھر رفتار کا تصور ابھرا۔اس طرح ایک تبدیلی دوسری تبدیلی کا پیش خیمہ بنتا گیا۔

اگر تاریخِ انسان پر نظر دوڑائی جائے تو اس ترقی کے دوڑ میں ہمیشہ دو طاقتیں آپس میں برسرِ پیکار رہے ہیں ایک ارتقائی طاقتیں اور دوسرا جمودی طاقتیں۔جمودی طاقتیں وہ مراعات یافتہ طاقتیں ہوتی ہیں جو کسی نظام سے استفادہ کر رہے ہوتے ہیں، یہ معاشرے کو پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے سے روکے رکھتے ہیں ،اور دوسرا ارتقائی طاقتیں یہ وہ مظلوم اور محکوم طاقتیں ہوتی ہیں جو کسی نظام کے ہاتھوں پس رہے ہوتے ہیں ، یہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔اور یاد رکھیں دنیا کو تبدیل کرنے اور ترقی کے سفر کو جاری رکھنے کے ذمہ دار ہمیشہ ارتقائی طاقتیں ہی رہی ہیں،جمودی اور ارتقائی قوتوں میں ہمیشہ جدل یا لڑائی ہوتی رہتی ہے جس کے نتیجہ میں سماج آگے بڑھتا ہے۔اگر ہم سیاسی زبان میں ان دونوں طاقتوں کو نام دیں تو ہم ارتقائی طاقتوں کو بائیں بازو اور جمودی طاقتوں کو دائیں بازو کہہ کر پکارتے ہیں۔

دائیں اور بائیں بازو کا تصور انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے زمانے میں وجود میں آیا۔جس نے اپنے زمانے میں زرعی اصلاحات متعارف کیں۔یعنی زرعی نظام میں کچھ مثبت تبدیلیاں لائیں۔اس مدعے پر بادشاہ کا ایوان دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا، جو لوگ ان تبدیلوں کے مخالف تھے وہ بادشاہ کے دائیں جانب بیٹھ گئیں اور جو لوگ ان تبدیلیوں کے حق میں تھے وہ بادشاہ کے بائیں جانب بیٹھ گئیں۔تب سے یہ الفاظ سیاست میں اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے ۔مطلب جو لوگ تبدیلی کے حق میں ہوتے ہیں انہیں بائیں بازو سے تشبیہ دی جاتی ہے اور تبدیلی مخالف لوگوں کو دائیں بازو سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اگر ہم اپنے پورے سماجی تاریخ پر ایک نظر دوڑائیں تو ہمیں پورے تاریخ میں یہ دو قوتیں تکرار میں نظر آتے ہیں ،اور ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ان دونوں کی آپس میں تضاد کی ہی وجہ سے معاشرہ آگے کی طرف بڑھتا ہے۔اور اسی کو فلسفہ کی زبان میں جدلیاتی مادیت سے مراد لیتے ہیں۔

انسان غاروں میں رہتا تھا اور شکار کا کچا گوشت کھا کر زندگی گزار رہا تھا۔لیکن جب انسان نے آگ جلانا سیکھا ،دریاوں کے نزدیک بستیاں آباد کیں تو تمدن کا دور شروع ہوا۔تمدن سے مراد انسان کی شہری زندگی ہے۔لوگ قبائل کے صورت میں

اکھٹا رہنے لگے، درختوں کے پتوں کے بجائے کپڑے سے تن ڈھانپنے لگے۔ پھر کھیتی باڑی کے دور میں بہت سے قبائل مل کر وسیع سلطنت بنانے شروع کیں، اور ان قبیلوں میں سے سب سے طاقتور قبیلے کے سردار کو اپنا بادشاہ بنانا شروع کیا۔ اس طرح سلطنت کا وجود عمل میں آیا۔ اس وقت بھی دو گروہ وجود رکھتے تھے ایک وہ دائیں بازو کے لوگ جو قدیم قبائلی نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے دوسری وہ بائیں بازو کے لوگ جو سلطنت چاہتے تھے۔ ادھر بھی انسانی ترقی کے پہیے کو آگے بڑھانے والے بائیں بازو کی سوچ اور لوگ تھے۔ یہ زرعی معاشرہ پانچ ہزار سال تک قائم رہا، یہاں تک کے ۱۹ ویں صدی میں صنعتی انقلاب برپا ہوا، صنعتی انقلاب نے زرعی معاشرے کی جڑیں ہلا دیں۔ بڑی بڑی صنعتیں قائم ہوئیں، بادشاہت کی جگہ سرمایہ دارانہ جمہوریت نے لے لی، صنعتوں کو ترقی دینے کیلئے نت نئے ایجادات ہوئے، جن ایجادات نے انسان کی زندگی اور رہن سہن کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس وقت بھی اس معاشرے میں بائیں بازو اور دائیں بازو کے لوگ تھے۔ دائیں بازو کے لوگ بادشاہی دور کے حامی تھے اور جاگیردارانہ نظام کو طول دینا چاہتے تھے۔ اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لوگ بادشاہت اور جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت چاہتے تھے۔ یہاں بھی ان دو قوتوں کی بیچ لڑائی اور ٹکراو ہوا۔ پیرس کمیون، کروموئیل و چارلس اول جنگ اور انقلابِ فرانس اسی ٹکراو کی مثالیں ہیں۔ بالآخر یہاں بھی بائیں بازو کے طاقتوں کو فتح نصیب ہوئی اور انسانی ترقی اپنے راہ پر گامزن ہوگئی۔ پھر صنعتی انقلاب نے انسانی سوچ اور اندازِ معیشت کو یکسر بدل دیا۔ یہاں پھر سرمایہ دار اور مزدور کی صورت میں ایک بار پھر ٹکراو شروع ہوا۔ اب سرمایہ دار دائیں بازو کے بن گئے اور مزدور بائیں بازو کے۔ اس تضاد کی وجہ سے اشتراکیت نے جنم لیا۔ آج اشتراکیت اور مارکسزم بائیں بازو کی سوچ کہلاتی ہے لیکن ممکن ہے کے آج سے سو سال آگے یہ بھی ایک رجعتی سوچ کہلائے اور دائیں بازو یعنی ترقی مخالف قوتیں بن جائیں اور بائیں بازو والی قوتیں کچھ ایسے ترقی پسند قوتیں ہوں جن کا ابھی ہمیں ادراک بھی نہیں کے وہ کیسا نظام چاہیں گے۔ مطلب ترقی کا یہ سفر یونہی چلتا رہے گا۔

اب یہاں دو انتہائی اہم سوال جنم لیتے ہیں پہلی یہ کہ اگر انسانی سماجی ترقی ایک فطری عمل ہے اور اسے روکا نہیں جا سکتا تو پھر انسانوں کو جدوجہد کی کیا ضرورت ہے؟ دوسری یہ کے اگر انسانی سماج اسی اعتبار سے ترقی کرتا رہا ہے تو پھر بلوچ سمیت دنیا میں کئی قومیں آخر کیوں سماجی اعتبار سے دوسری قوموں سے پسماندہ ہیں ؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کی مثال ہم ایک ایسے گول چیز سے لے سکتے ہیں جو کسی پہاڑ کے ڈھلان سے نیچے کی طرف آہستہ آہستہ لڑھکتے ہوئے جا رہا ہے، لیکن اس بیچ میں وہ کسی پتھر یا جھاڑی سے اٹک جاتا ہے اور اس کا یہ فطری عمل کسی غیر فطری قوت کی وجہ سے رک جاتی ہے تو اسے وہاں ایک دھکے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی دھکے کو ہم آسان الفاظ میں انقلاب کہتے ہیں۔ مطلب ارتقاء کے عمل میں جب رکاوٹ یا آہستہ پن آجاتا ہے تو پھر اسے انقلاب کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ انقلاب بذاتِ خود اس ارتقائی عمل میں ایک جست ہے۔ اب اس جست کیلئے یا اس گول چیز کو دھکے کیلئے جو قوت ضرورت ہوتی ہے اسے ہی عام زبان میں جدوجہد کہا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کے سماجی ارتقائی عمل کو ہمیشہ لوگوں کی شرکت کی ضرورت ہوتی اور یہ لوگ ہمیشہ وہ ترقی پسند بائیں بازو کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیئے ہم کہتے ہیں کے انسانی ترقی ہمیشہ مظلوموں و محکوموں کی مرہونِ منت رہی ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب پہلے سوال کے ہی جواب میں پنہاں ہے، آج بلوچ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ سماجوں کے مقابلے میں اس لیئے پسماندہ ہے کیونکہ یہاں بھی ارتقاء کے سامنے ایک رکاوٹ کھڑی ہوگئی ہے۔ اور یہ رکاوٹ بلوچ سماجی ترقی کو روکنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ جب سماجی ترقی رک جاتی ہے تو اس کی مثال اس ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہوتی ہے جس میں نا کہیں سے پانی آرہا ہے اور نا ہی اس سے نکل رہا ہے، ایسا پانی جوہڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے تعفن اٹھنے لگتی ہے، یہ روز بروز زیادہ بدبودار ہوتا جاتا ہے۔ آج اگر ہم بلوچ سماج پر ایک نظر دوڑائیں تو ہمیں بہت ساری چیزیں بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ ہم اب تک ایک نیم قبائلی اور نیم زرعی معاشرے میں رہ رہے ہیں، یہ وہی نظام ہے جس میں دنیا آج سے سینکڑوں سال پہلے رہ رہی تھی۔ ہمارے سارے بنیادی ادارے اس رکاوٹ کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئیں ہیں۔ ہمارا بنیادی خاندان کا ادارہ روز بروز ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا جا رہا ہے، جنریشن گیپ انتہائی زیادہ بڑھ رہی ہے، ہمارا کلچر کوئی بھی واضح شکل اختیار کرتا ہوا نظر نہیں آرہا، ہماری موسیقی، آرٹ اور دوسری تخلیقات ایک مکمل جمود اور بوسیدگی کا شکار ہیں، ہماری سیاست کوئی بھی اخلاقیات مرتب نہیں کر پا رہی، سیاسی نظریات چھوڑنا

پارٹیاں بدلنا اب برے کے زمرے میں ہی نہیں آرہی۔ہم ایجادات کی صورت میں شاید انسانیت کو کچھ بھی دینے میں ناکام ہورہے ہیں۔تعلیم کا ادارہ تو سرے سے ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ہمارے پیداواری اداروں کا طریقہ کار انتہائی خستہ اور پرانا ہے اوران کی بھی مقدار اور قیمت کا تعین ہمارے ہاتھ میں نہیں۔اس کے علاوہ ہم زندگی کے شاید ہر میدان میں انتہائی پیچھے ہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ میرے اداروں کے اس تشریح سے اتفاق نہیں کررہے ہیں کیونکہ آپ اداروں کو ۲۰۰۱ کے بعد کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں جہاں ایک مختصر سے انقلابی عمل نے شاید ان کے حالت زار میں تھوڑی مثبت تبدیلیاں لائی ہیں،اور میں ان کو مجموعی طور پر دیکھ رہا ہوں۔

اب یہاں یہ سمجھنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے کے آخر بلوچ سماجی ارتقاء کے آگے رکاوٹ کیا ہے،اس رکاوٹ کو سمجھنے کیلئے ہمیں نوآبادیاتی نظام کے تاریخ میں جانا پڑے گا۔نوآبادیاتی انگریزی کے حرف کا لونیلزم کا معنی ہے جس کا مطلب نئی بستیاں بسانا۔نوآبادیاتی نظام کی ابتداء یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد شروع ہوئی۔جب یورپ میں صنعتیں لگنی شروع ہوئی تو وہاں پیداوار میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔یہ پیداوار اپنے ملک کے ضروریات سے کئی گنا زیادہ تھی یا پھر معاشیات کے زبان میں کہیں تو وہاں کے لوگوں کی قوت خرید سے کئی گنا زیادہ تھی۔اور یہ پیداوار سرمایہ داروں نے بڑھایا بھی صرف منافع کیلئے تھا۔اب کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت بھی سرمایہ داروں کی ہی ہوتی ہے۔اس لیئے انہوں نے اپنے ملکوں کے سرحد سے باہر اپنے پیداوار کی کھپت کیلئے نئی منڈیاں ڈھونڈنی شروع کی،منڈی کا مطلب سامان سے کھچا کھچ بھرا کوئی بازار نہیں ہوتا اس کا مطلب عام لوگ اور ان کا قوت خرید ہوتا ہے۔اس مقصد سے انہوں نے دنیا کے تقریباً ۸۰ فیصد علاقوں پر قبضہ کرلیا باقی کے ۲۰ فیصد وہ خود تھے۔قبضہ کرنے کے بعد وہاں انہوں نے دو بنیادی کام کئے پہلی یہ کے یہاں لاکر اپنی مصنوعات بیچنے لگے اور دوسری یہ کے قبضہ کئے ہوئے علاقوں کے وسائل کو لوٹ کر اپنے صنعتوں کو ترقی دینے لگے۔

بلوچستان بھی اسی کالیونیلزم کا شکار ہوا جہاں انگریز نے آکر ۱۳ نومبر ۱۸۳۹ کو اپنا قبضہ کیا۔یہ سرمایہ دار ۲۰۰ سال تک پوری دنیا کو لوٹتے رہے لیکن بیسویں صدی میں معاملات نے اس وقت کروٹ لی جب ان سرمایہ دار ملکوں کے بیچ منڈیوں کے اوپر دو بڑی جنگیں ہوئیں جنہیں ہم آج پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے جانتے ہیں۔ایک طرف ان جنگوں نے سرمایہ دار ملکوں کیلئے یہ ناممکن بنادیا کے وہ ہر جگہ اپنی فوج کے ساتھ اپنے کالونیوں کو نکیل ڈالتے رہیں اور دوسری طرف ان کالونیوں میں بڑھتی ہوئی آزادی کی تحریکوں نے بھی ان کا یہ کام انتہائی مشکل بنادیا۔یہاں سے پھر نیو کالیونیلزم یا نونوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوا۔اس نئے نظام کے تحت انہوں نے پوری دنیا میں اپنی مرضی کے سرحد بنانے شروع کئے، چھوٹی قوموں کو بزورِ طاقت ملا کر نئے ملک تخلیق کئے،اور پھر ان ملکوں کو فوجی لحاظ سے انتہائی مضبوط بنایا تاکہ وہ ان کے مفادات کی تحفظ کریں۔سرحدات کے تقسیم کے بعد انہوں نے یہاں ایسا معاشی نظام بنایا کے جہاں وہ ان ملکوں کے معشیت کو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے زریعے مکمل اپنے قابو میں رکھیں۔اب فوج کے بجائے وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے توسط سے اپنے وہ دو بنیادی مقصد حاصل کرتے ہیں جن کیلئے انہوں نے پہلے لشکر کشی کی تھی۔یعنی اپنے مصنوعات کی کھپت کیلئے منڈیوں کا حصول اور وسائل کو لوٹ کر اپنے صنعتوں کو ترقی دینا۔لوٹ کھسوٹ کا بازار یونہی گرمی سے چلانے کیلئے یہ انتہائی ضروری تھا کہ یہ مقبوضہ قومیں پرانے قبائلی اور زرعی نظام میں جکڑے رہیں۔ان مقبوضات کی معیشت اور سماج کو زراعت پر جامد رکھ کر ہی وہ یہاں اپنے صنعتی مصنوعات بیچ سکتے تھے۔اگر یہ مقبوضہ معاشرے ترقی کے سیڑھی پر چڑھ کر صنعتی معاشرے میں قدم رکھتے تو سامراج کو دو بڑے نقصانات ہوتے پہلی یہ کے یہ قومیں خود مصنوعات بنانا شروع کرتے جس سے ان کے مصنوعات کی کھپت میں ایک بڑی کمی آجاتی اور دوسری یہ کے وہ اپنا خام مال سستے داموں بیچنے یا لوٹتے دیکھنے کے بجائے اسے اپنے صنعتوں میں خود ہی استعمال کرتے۔ہم اس نیو کالیونیلزم کا بھینٹ ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ کو چڑھے جب سامراجی مفادات کے حصول کیلئے بنی ہوئی باجگزار ریاست پاکستان نے ان سرمایہ داروں کے مفادات کی تکمیل کیلئے ہمارے اوپر لشکر کشی کرکے قبضہ کرلیا،اور اپنے فوجی طاقت اور معاشی پالیسیوں سے ہمیں پسماندہ رکھا تاکہ ہمارے وسائل کو لوٹ کر ان سرمایہ داروں کو سستے دام بیچے جاسکیں،اور ہم ان سرمایہ داروں کیلئے ایک منڈی بنے رہیں۔

اب ہم دوبارہ اپنے بنیادی سوال کے پاس جاتے ہیں کے ''بلوچ سماج کے ارتقاء کے آگے رکاوٹ کیا ہے؟'' نوآبادیاتی نظام کو سمجھنے کے بعد اب ہمارے پاس اس کا واضح جواب ہے کے وہ رکاوٹ کالونیلزم ہے جس کے تحت ہم ایک مقبوضہ ریاست ہیں۔اب جب تک ہم مقبوضہ رہیں گے تب تک ہمارے لیئے معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی ناممکنات میں سے ہیں۔جیسا کے پہلے کہا جاچکا ہے کے جب

ارتقاء کے آگے کوئی رکاوٹ آجائے تو وہاں ایک دھکے یا جست کی ضرورت ہوتی ہے اور اس جست یا دھکے کو انقلاب کہتے ہیں اور بلوچ مسئلے کے تناظر میں ہم اسے آزادی کہتے ہیں، اور اس جست یا دھکے پر لگے ہوئے توانائی کو جدوجہد کہتے ہیں

۔

اب اس موڑ پر پہنچ کر جہاں ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کے ہمارے سماجی پسماندگی اور ارتقاء کے آگے رکاوٹ غلامی ہے، اور ہم یہ بھی جان چکے ہیں کے اس کے حل دھکا یا آزادی ہے اور ہمیں یہ بھی پتہ چل چکا ہے اس کا طریقہ کار جدوجہد ہے۔ تو اب ہمارے سامنے ایک اور نیا سوال آکر کھڑا ہو گیا ہے، کہ یہ جدوجہد آخر کون کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟

کسی بھی سماجی تبدیلی کیلئے جدوجہد وہ لوگ کرتے ہیں، جو اس سماجی نظام کے ہاتھوں پس رہے ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ میں طاقت نہیں ہوتی، اور ایسے تبدیلی کو روکنے کیلئے ہمیشہ ایک اقلیت ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے اور وہ اس سماجی نظام سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے ۔اسلیئے وہ کسی بھی قیمت پر اس نظام کو بدلنے نہیں دیتے ۔کیونکہ لوگوں کے ہاتھ میں طاقت نہیں ہوتا تو اسلیئے وہ تحریک چلاتے ہیں ۔تحریک ایک پارٹی یا تنظیم نہیں ہوتی کہ کچھ لوگ میٹنگ کر کے جدوجہد کا فیصلہ کرتے ہیں بلکہ تحریک کے اندر پارٹی ہوتی ہے۔تحریک کا اپنا ہی منطق اور طریقہ کار ہوتا ہے۔تحریک کیونکہ عام لوگوں کے اندر سے ہی جنم لیتی ہے تو اس کے سمجھنے کیلئے صرف تاریخ اور اپنے معاشرے کا مشاہدہ کافی ہے لیکن اگر ہمیں تحریک کو جدید سائنسی بنیادوں پر سمجھنا ہے تو ہمیں ایک بار نئے سماجی سائنسدانوں کے پاس جانا پڑے گا، اس کیلئے سب سے موزوں امریکی ماہر عمرانیات ہربرٹ بلیومر ہی ہو سکتے ہیں جس نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی تحریکوں کے محرکات کو جاننے پر لگادی۔

ہربرٹ بلیومر کسی بھی تحریک کی پوری ''لائف سایکل'' کو چار اسٹیج میں تقسیم کرتا ہے۔ ۱۔ابھار ۲۔ارتکاز ۳۔تنظیم ۴۔خاتمہ آگے وہ ان تمام مراحل کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

1۔ابھار Emergence: یہ کسی بھی تحریک کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے اس میں نا کوئی پارٹی ہوتی ہے اور نا کوئی عمل، اس شروعاتی مرحلے میں لوگوں میں ایک بے چینی پھیلتی ہے، اپنے حالت زار سے، اپنے اردگرد سے، اپنے نظام سے، وہ سوال پوچھنے لگتا ہے اور سوچنے لگتا ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی معاملات پر تبادلہ خیال شروع کرتا ہے، وہ ایسے ہر چیز پر تنقید کرنا شروع کرتا ہے، جس کے بارے میں اسے لگے کے وہ اس کے پسماندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں فرد بے چین ہوتا ہے اور کبھی کبھار وہ اپنی بے چینی اور نفرت کا اظہار اپنے کسی انفرادی متشددانہ عمل سے کرتا ہے۔

2۔ارتکاز Coalescence : یہ تحریک کا دوسرا مرحلہ ہوتا ہے، یہاں موجودہ نظام سے نفرت کرنے والے لوگ اکھٹا ہونا شروع کرتے ہیں۔ یہ مل کر احتجاج کرتے ہیں، جلاؤ گھیراؤ کرتے ہیں، یا اجتماعی طور پر کوئی متشددانہ کاروائی کرتے ہیں۔ یہ اب اپنی بے چینیاں اور نفرت ایک دوسرے کو بتاتے ہیں، انکی سوچ ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتی جاتی ہے، یہ سب اکھٹے ہونے لگتے ہیں۔ اب ان کا مسئلہ بے چینی نہیں ہوتا بلکہ ان کا مسئلہ اس بے چینی کی وجہ اور اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اب ان کے اندر کا نفرت اندر نہیں باہر آیا ہوا ہوتا ہے۔ اور ان کی نافرمانیاں چھپے اور انفرادی نہیں بلکہ باہر اور منظر عام پر ہوتے ہیں۔ یاد رہے اس مرحلے میں کوئی تنظیم نہیں ہوتا۔

3۔تنظیم Bureaucratization or Organization: اس مرحلہ میں تمام ہم خیال لوگ مل کر تنظیم بناتے ہیں، اپنے ناپسندیدہ نظام کے خلاف کس طرح جدوجہد کرنی ہے اس کے طریقہ کار واضح کرتے ہیں، ہر معاملے کو ایک ڈسپلن کے تحت لیجاتے ہیں، اپنے اندر کی نفرت اور بے چینی کو اپنی طاقت بناتے ہیں۔ ایک منظّم طریقے سے اس نظام کو توڑنے کیلئے اپنی قوت اور حکمت کو استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کے بیچ جا کر انہیں ان کے حالت زار سے آگاہ کر کے اپنے ساتھ ملاتے ہیں، اور خود کو ایک قوت میں ڈھالتے ہیں۔

4۔خاتمہ Decline : یہ لفظ سننے میں منفی لگتا ہے لیکن، یہ ہمیشہ سے ہر تحریک کا حصہ رہا ہے کسی بھی تحریک کا خاتمہ چار طریقوں سے ہوتا ہے۔

ا۔ریاستی جارحیت Repression: جب کوئی تحریک اپنے عروج پر پہنچتی ہے اور اس نظام کیلئے خطرہ بن جاتا ہے تو، ریاست اپنے ظلم اور جبر سے اس تحریک کو ختم کر دیتا ہے، یہ بھی تحریکوں کے ختم ہونے کی وجہ بنتی ہے۔ لیکن اگر کوئی تحریک اس طرح سے ختم ہو جائے تو وہ دوبارہ سے وقت کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور دوبارہ سے اس ''لائف سایکل'' کو دہراتا ہے۔

اا۔شراکت داری Co-optation: اس طرح کسی بھی تحریک کا خاتمہ تب ہوتا ہے، جب لوگوں کی شراکت داری کسی تحریک سے، کسی لیڈر کی کرشماتی شخصیت کی

وجہ سے بن جائے اور جب وہ لیڈر مر جائے یا مقصد چھوڑ دے تو وہ تحریک ہی ختم ہوجائے۔ جب تحریکیں اسطرح ختم ہوجائیں تو وہ بھی پھر سے دوبارہ اپنا ''لائف سایکل'' دہراتے ہیں۔

iii۔ ناکامی Failure: جب کوئی تحریک اپنے وقت سے پہلے، یا ضروری لوازمات پورے کئے بغیر شروع ہوجاتا ہے تو پھر وہ ناکام ہوجاتا ہے، ایسی تحریکیں پھر کافی وقت کے بعد موزوں وقت آنے پر کسی اور صورت میں شروع ہوتی ہیں۔

iiii۔ کامیابی Success: جب کوئی تحریک کامیاب ہوجائے تو اسے بھی اس تحریک کا خاتمہ کہا جاتا ہے، کیونکہ کوئی بھی تحریک کچھ خاص مقاصد حاصل کرنے کیلئے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ مقاصد حاصل ہوجاتے ہیں۔ تو پھر اس تحریک کے مزید رہنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا اسلیئے وہ تحریک اپنے کامیابی کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے۔

ہربرٹ بلیومر کے اس سائنسی تجزیہ سے ایک بات کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے کے ارتقا کے آگے جو رکاوٹ ہوتی ہے اس کو سب سے پہلے عام مظلوم و محکوم طبقہ ہی محسوس کرتا ہے، وہی لوگوں کو اکھٹا کر کے ایک منظّم طریقے سے ارتقاء کیلئے ایک دھکا یا جست انقلاب کی صورت میں لاتے ہیں۔ اب ہمیں شروع میں پوچھے گئے اپنے سوال ''یہ جدوجہد آخر کون کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟'' کا جواب مل گیا، مطلب اگر بلوچ سماج کو آگے بڑھنا ہے تو اس کیلئے میرے اور آپ کے جیسے مظلوم و محکوم لوگوں کو ہی جدوجہد کرنا پڑے گا۔ آج ہم بلوچستان میں بھی دیکھ رہے ہیں کے دو قوتیں سرگرمِ عمل ہیں ایک وہ جو اس نظام کو بدلنے یا سماجی تبدیلی کے حق میں جدوجہد کر رہے ہیں یعنی کے بائیں بازو کے لوگ جو مختلف ناموں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور دوسری قوت ان دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ہے جو اس نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اسے بدلنا نہیں چاہتے اس میں سرفہرست پاکستانی فوج اور پنجابی بیوروکریسی و سیاستدان ہیں اس کے علاوہ ہمارے اندر بھی ایسے عناصر ہیں جو اس پاکستان جیسے طفیلی ریاست کے باجگزاری میں رہ کر اس نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ان میں نام نہاد بلوچ سردار، مذہب کے ٹھیکیدار مولوی حضرات، پیٹ پرست سیاست دان وغیرہ شامل ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کے دنیا کی ترقی میں آج تک کردار صرف بائیں بازو کی سوچ اور کرداروں کا رہا ہے۔ اور کامیابی ہمیشہ ان ہی کی ہوئی ہے۔ آج بلوچ قومی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والے نا صرف بلوچ وطن کی آزادی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں بلکہ وہ پورے انسانیت کی مجموعی ترقی میں بھی اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے ہیں، تاریخ اور دنیا ایسے ہی لوگوں کی محتاج رہی ہے۔ اگر ایسے لوگ اور سوچ نہیں ہوتے تو انسان آج بھی کسی اندھیرے غار میں کچا گوشت کھا رہا ہوتا۔

بلوچ کی سماجی اور معاشی حالت تب تک نہیں بدل سکتی جب تک کے وہ اپنی آزاد حیثیت بحال نہیں کرتی، ریاست پاکستان کو بنانے کا مقصد ہی بلوچ جیسے قوموں کو پسماندہ رکھنا ہے، ہم پاکستان کے اندر رہ کر کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر ہمیں قرونِ وسطیٰ جیسے حالات سے نکل کر ترقی کرنا ہے تو ہمیں جدوجہد کرنی ہوگی۔ نا صرف اپنی ذات، خاندان اور قوم کی خاطر بلکہ پورے انسانیت کی خاطر۔

بہت ہی شدید قسم کے معاشی اور سیاسی بحران کے دور میں طبقاتی جدوجہد پک کر براہ راست خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لیے ہے۔۔۔

☆☆☆ لینن ☆☆☆

ہم آہنگی کے عمل کا اصول

ادارہ

کسی کاروبار یا فوجی ادارے کیلئے ٹیم ورک اور ذہنی ہم آہنگی بنیادی طور پر بہت اہم ہوتی ہے۔

جب آپ اپنے شعبے کے دیگر لوگوں کے ساتھ ملکر ذہنی ہم آہنگی سے اور اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کرتے ہیں تو آپ کی طاقت کئی گناہ بڑھ جاتی ہے۔اس طرح وہ کام جو آپ بہت زیادہ وقت میں اکیلے کریں گے دوسروں کی مدد سے وہی کام کم وقت میں کرنا زیادہ آسان ہوجائے گا۔

چکاموگا کی جنگ۔۔

ہم آہنگی ہوتو پھر یہ ایک ایسی بھرپور طاقت ہوگی جس کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

ہم آہنگی کے عمل کا اصول کاروبار میں

کسی بھی کاروبار کے لیڈرشپ میں یہ اہمیت ہونی چاہیے کہ وہ بہترین کارکردگی کے اہل ہنرمندوں کو اپنے ادارے میں اکٹھا کرے اور ان تمام افراد کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کرے، وہ تمام افراد اپنی بہترین صلاحیتوں سے کاروبار میں مقرر کیے اہداف تیزی سے وقت سے پہلے حاصل کرلیں۔ایک ہم آہنگ لوگوں کا گروہ، ایک زبردست طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ایسا گروپ پیداواری عمل میں تیزی سے بہتری پیدا کرسکتا ہے۔جبکہ

''ہم آہنگی کے عمل کا اصول، اپنی سرگرمیوں کو مربوط کریں۔''میں نے جلدی ہی سیکھ لیا کہ ٹیم ورک کیا ہوتا ہے۔سب لوگ مل کر مشترکہ ہدف کی جانب بڑھیں تو ہر کوئی بہتر کام کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ہر کوئی بتانا چاہتا ہے کہ وہ کسی سے پیچھے نہیں ہے۔'' ☆(آرتھر اوکس)☆

جب کچھ قوتیں ملکر ہم آہنگی اور احسن طریقے سے تیزی سے کام کرتی ہیں تو وہ ان قوتوں کو برباد کردیتی ہیں جو ان کے مدمقابل ہوں لیکن ان میں ہم آہنگی نہ ہو۔

18 اگست 1863ء میں ایک جنگ متحدہ فوجوں اور چیمبر لینڈ کی فوج کے درمیان چکاموگا کے مقام پر لڑی گئی۔متحدہ فوجوں کی کمان جنرل ولیم ایس روزکرین کررہا تھا اور ٹینیسی فوج کی کمان جنرل براکسٹون بریگ کررہا تھا۔

روزکرین نے کچھ چھوٹی چھوٹی فتوحات کی تھیں اس لئے وہ بہت ہی بلکہ ضرور سے زیادہ پراعتماد تھا۔روزکرین نے اپنی فوج چکاموگا کھاڈی کے ساتھ ساتھ پھیلا دی جبکہ بریگ نے اپنی پوری توجہ روزکرین کے خلاف مرکوز رکھی۔روزکرین نے ایک فیڈرل ڈویژن کو حکم دیا کہ زوردار حملہ کیا جائے۔اس ڈویژن کی کمان جنرل لونگ سٹریٹ کررہا تھا۔

لونگ اسٹریٹ نے ایک ڈویژن کو پیچھے رکھا اور دوسرے ڈویژن کو دفاعی لائن توڑنے کا حکم دیا۔جبکہ تیسرے ڈویژن کو حکم تھا کہ وہ آخر میں بھرپور حملہ کرے۔ان تینوں ڈویژنوں میں ایک زبردست ہم آہنگی تھی۔سب کام جنرل روزکرین کے تصور کے عین مطابق ہوا اور اس پر اعتماد فوج نے فتح حاصل کرلی۔

منگول فوج کی ہم آہنگی

منگول کا ایک تومان ایک ڈویژن کے برابر ہوتا تھا۔چنگیز خان کی قیادت میں دس ہزار منگول تھے۔منگول فوج کا ہر دستہ دو تومان پر مشتمل تھا یعنی ایک دستے میں 20000 منگول ہوتے تھے۔

منگولوں کے مدمقابل ہمیشہ لاتعداد لشکر ہوتے تھے، لیکن منگولوں نے کبھی بھی جنگ نہ ہاری تھی۔کیونکہ منگول اپنے سرداروں کے ماتحت بہت ہی ہم آہنگی رکھتے تھے اور ہر منگول اپنی انفرادی کارکردگی بھی رکھتا تھا۔اس وجہ سے اس زمانے کی منگول فوج دنیا کی بہترین فوج تھی۔

ہم آہنگی کے عمل کا اصول

''متحد ہوکر تمام عنصر کو یکجا کرکے پوری طاقت سے کام میں لگ جاؤ۔فتح تمہاری ہوگی''

جب سب لوگ اپنے مقاصد اور اہداف کو جانتے ہوں، انہیں منصوبہ بندی کا بھی پورا پورا علم ہو، انہیں اپنی زمہ داری کا بھی احساس ہو، انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل ربط اور

انفرادی طور پر کام کرنے والے ایسے ہم آہنگ گروپ کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتے۔

اعلیٰ ترین کارکردگی کا راز ٹیم ورک میں ہے

آج کل تمام قسم کے کام ٹیم ورک سے کئے جاتے ہیں، ٹیم ورک میں ہر کسی کی کارکردگی بہت بہتر ہوتی ہے۔ٹیم کا لیڈر جس کام کا تہیہ کرلیتا ہے اور اپنی ٹیم کو کام کرنے کا حکم دے دیتا ہے تو پھر ٹیم کا ہر فرد انفرادی کوشش سے دوسرے بڑھ کر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایسی ٹیم ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی بجائے بہترین کارکردگی دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ایسی ٹیم کو کمپنی کی بہترین ٹیم کہا جاتا ہے۔

کسی بھی کمپنی کے منیجر کے نتائج وہ ہوتے ہیں جو اس کی ٹیم حاصل کرتی ہے۔

کمپنی کا منیجر ہی ٹیم کے ہر فعل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ٹیم کو کیا کرنا ہے یا کیا نہیں کرنا اس کا انحصار منیجر پر ہوتا ہے۔وہی ٹیم کے تمام ورکروں کے درمیان ہم آہنگی کو برقرار رکھتا ہے۔وہ ٹیم کی توجہ کام کی جانب دلواتا ہے اور ساری ٹیم مل کر اس کام کو سرانجام دیتی ہے۔

ماضی میں عموماً کہا جاتا تھا اگر تم کوئی کام ڈھنگ سے کرنا چاہتے ہو تو وہ کام خود کرو لیکن آج کے دور میں یہ سب کچھ بدل چکا ہے۔آج اگر آپ کاروبار میں کامیابی چاہتے ہیں تو کچھ ایسے لوگوں کو تلاش کرو جو کاروبار کو کامیاب بنائیں۔آج کے دور میں ہر کام خود نہیں کیا جاسکتا۔

ٹیم ورک کیلئے اعلیٰ ذہین کے حامل، ہنرمند، اہل علم اور دیانت دار لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان تمام افراد کے درمیان ایک خاص ہم آہنگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔اگر ایسے لوگ دستیاب ہوجائیں تو ہر کام بہترین انداز میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔

بہترین منیجر اپنے لوگوں سے ہر طرح کی مثبت توقع رکھ کر مشکل صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں۔

بہترین جرنیل بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور فتح حاصل کرکے اپنے ماتحتوں پر فخر کرتے ہیں۔

آج کل کوئی بھی کام انفرادی طور پر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ کام کیلئے مختلف قسم کے ٹیلنٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کرکے کام کو احسن طریق سے کرلیتے ہیں۔

پھُلیں سرمچار "شہید۔کچکول بھار بلوچ"

چھاگلی بلوچ

دُنیا میں لاتعداد لوگ آئے اور چلے گئے مگر اِن سب میں سے الگ اور زندہ پہچان وہی رکھتے ہیں جو اپنی زندگی اک عظیم مقصد کے لیے وقف کردیتے ہیں۔ بلوچ تاریخ ایسے پُرعزم، باہمت اور جانثار فرزندوں کے عظیم کارناموں سے بھری پڑی ہے جو مادرِوطن کی آرزو اور بقاء کی خاطر گولیوں سے چلنی بدن کے ساتھ آزادی کی فکر کو دوام بخشتے اور اِس تحفظ کی خاطر ہمیشہ کے لیے مادرِوطن کی آغوش میں سو گئے۔

مادرِوطن کی اِن ہی بہادرُ اور عظیم فرزندوں میں سے ایک ''شہید کچکول بہار بلوچ'' ہے۔ شہید کچکول بہار ۱۹۸۶ء میں تربُت کے گاؤں ''گونکی'' میں پیدا ہوئے۔ شہید کچکول بہار بلوچ کا اصل نام ''کچکول علی'' تھا اور والد کا نام چاکر بلوچ تھا، شہید کی ماں کا نام ''بہار بی بی'' تھا، اپنی ماں سے بے پناہ محبت کی وجہ سے بعد ازاء اُس نے اپنے نام کے ساتھ ''بہار'' لکھنا شروع کی، جو بعد میں ان کا پہچان بن گیا۔

شہید کچکول نے ابتدائی تعلیم گونکی میں ہی حاصل کی، اور میٹرک ہائی سکول شاہرگ سے پاس کی، اس دوران وہ بلوچ اسٹوڈنٹس اُرگنازیشن (بی۔ایس۔او آزاد) سے مُنسلک رہے اس دوران وہ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی تعلیم اور شعوری علم سے لیس ہوتے رہے، اور ہمیشہ تنظیمی امور میں پیش پیش رہے۔

شہید کچکول بہار بلوچ سات بہنوں کا ایک ہی بھائی، سب ہی کے آنکھوں کا نور تھا۔ بہت ہی خوش اخلاق، خوش مزاج اور پُرخلوص تھا اپنے اسی خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور انسان دوستی کے باعث ہر پیر و ورنا کی دِل میں بستا تھا جیسے ہر کوئی محبت سے ''مینگ اور نورو'' کہہ کر پُکارتا تھا، جو آج بھی اسی انداز میں سب کے دِلوں میں زندہ ہے۔

شہید کچکول چونکہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، والد کے وفات کے بعد کچھ مشکلات کے سبب اپنا تعلیمی سلسلہ آگے جاری نہیں رکھ پائے۔ والد کے وفات کے کچھ عرصے بعد وہ شاپک چلے گئے اور وہی رہائش پذیر ہوگئے۔ مگر اس دوران بھی شہید کچکول نے اپنا سیاسی اور شعوری سفر جاری رکھا اور بلوچ نیشنل موومنٹ (بی۔این۔ایم) میں شمولیت اختیار کی۔

کفن میں لپٹے کچکول کے چھرے پہ اطمینان اور مسکراھٹ اس بات کی گوائی تھی کہ وہ اپنی مادرِوطن کے سامنے سُرخ رُوح ہوگیا، اور تمام بلوچ فرزنداں کے لیے یھی پیغام چھوڑا، کہ صرف لفاظی نھیں بلکہ ھمیں عملی جدوجھد کرنا ہوگی، قوم کے ہر فرد کو اپنی زمہ داری کا احساس کرکے نیک نیتی و مخلصی سے اپنے فرائض ادا کرنے ھونگے

''شہید کچکول بہار بلوچ کو موسیقی سے بے پناہ محبت تھی، انہوں نے اپنے آواز فن موسیقی اور انقلابی گانوں کے زریعے جُہد آزادی کی تبلیغ جاری رکھی اور اپنے اس فن کے زریعے قوم میں شعور بیدار کرتے رہے۔ مگر قوم کی غلامی اور ذلت کے احساس نے اُسے مسلح جہد جہد کی طرف راغب کیا، جسکی وجہ سے شہید کچکول بلوچ حریت پسند فوج ''بلوچ لیبریشن فرنٹ (بی۔ایل۔ایف)'' میں بطور سپاہی شامل ہوگئے۔ علمی اور شعوری ہتھیار سے لیس مادرِوطن کے سنگلاخ پہاڑوں میں انقلابی بندوق تھام کر ہر محاذ پر جوان مردی سے دُشمن کا مقابلہ کیا، وہ دیگر امور کے ساتھ ساتھ گوریلہ معمولات میں پیش پیش رہتے۔ مشکے سے لے کر مکُران تک ہر محاذ میں بحثیت ایک بہادُر سپاہی کے مادرِوطن کی دفاع میں پیش پیش رہے۔ وہ کہتے کہ میں نہیں چاہتا میری آہندہ آنے والی نسل غلامی میں پھر اپنے فن کا رونا

روئے، میری انقلابی بندوق سے نکلنے والی ہر اُس گولی کی آواز جو دوشمن کی سینے کو چیر کے اُسے موت سے ہمکنار کرے، اب یہی میری آواز اور یہی میری گلوکاری ہے۔

شہید کچکول مزاجاً نرم گُو اور ہمیشہ مُسکرا کر بات کرنا اِس کی شخصیت کی پہچان تھی، اِن کی دوستی بھی اِن کی طرح بے مِثال تھی، ہر طرح کے مشکل حالات میں کبھی دوستوں کا ساتھ نہیں چھوڑا، ہر محفل کی جان تھے، ان کے بغیر دوستوں کا ہر محفل ادھورا تھا،

۷ اگست ۲۰۱۳ بدھ کی رات، جس رات کچکول کے نکاح کی تیاریاں دھوم دھام سے جاری تھیں سب شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے، اُسی شام کچکول گھر سے باہر کسی کام سے گئے جہاں پہلے سے گھات لگائے دشمنوں نے بزدلانہ وار کر کے اُسے شہید کر دیا، اگلی صبح اسکی لاش ملی جسے سر پے گولیاں مار کر شہید کیا گیا تھا ۔اُسے شاپک کے قبرستان میں، جس شان، عظم و حوصلے اور عہد و پیماں کی ساتھ ہزاروں فرزنداں کی موجودگی میں سپُردِ گُل زمین کیا گیا وہ لمحہ دشمن کے لیے کسی ازیت سے کم نہیں ہوگا، مگر دشمن یہ یاد رکھے کہ ہم نے شہید کچکول کے ساتھ اُن کے نظریہ مقصد اور فکر کو دفن نہیں کیا۔ جو کسی عظیم مقصد کے لیے نثار ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے، اُن کی زندگی، اُن کا نظریہ اور فکر آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتی ہے۔

”هون شهیدانی پُل رودیناں“
مکهیں گلزمینء دلبندء“

کفن میں لپٹے کچکول کے چہرے پہ اطمینان اور مسکراہٹ اس بات کی گوائی تھی کہ وہ اپنی مادرِوطن کے سامنے سُرخ رُوح ہو گیا، اور تمام بلوچ فرزنداں کے لیے یہی پیغام چھوڑا، کہ صرف لفاظی نہیں بلکہ ہمیں عملی جدوجہد کرنا ہوگی، قوم کے ہر فرد کو اپنی زمہ داری کا احساس کر کے نیک نیتی و مخلصی سے اپنے فرائض ادا کرنے ہونگے۔ ذاتی انا اور خود پرستی کے خول سے نکل کر صرف اور صرف مادرِوطن کی آزادی کے لئے دن رات وقف کرنے ہونگے، بلوچ قوم کی بقا کی جنگ آخری قدم تک لڑنا ہوگا۔

مجھے یہ بات کبھی پسند نہیں آتی کہ لیڈر اپنی لیڈری کا سکہ یوں جمائے کہ زیادہ مراعات حاصل کرنے کی سوچے اور زیادہ سے زیادہ آسائش حاصل کرنے کی فکر میں رہے۔ یہ سب تو سرمایادارانہ معاشرہ کی پیداوار ہے۔ میرے خیال میں ہر راہنما پر فرض ہے کہ وہ عام کارکنوں کی سطح پر زندگی بسر کرے۔ بلکہ ہوسکے تو ان سے بھی زیادہ قربانی کا جذبہ خود میں پیدا کرے۔ اس قسم کی عملی مثالوں ہی سے تو آپ اصولوں کی سچائی کا جیتا جاگتا ثبوت مہیا کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔

☆☆☆ هوچی منه ☆☆☆

انسانی حقوق کی چند نمایاں تحریکیں

ادارہ

انسانی حقوق کے تصور کے ارتقا میں جہاں کچھ تاریخی واقعات جیسے انقلاب فرانس، دوسری عالمی جنگ، اقوام متحدہ کا قیام اور انسانی حقوق سے متعلق دستاویزات میں امریکہ کا اعلانِ آزادی اور میگنا کارٹا کی اہمیت ہے وہاں ان تحریکوں کو بھی خاص مقام حاصل ہے جو انسانی حقوق کو تسلیم کروانے کی جدوجہد کا حصہ رہیں۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق سے آگاہی اور سماجی بیداری کے لیئے جن تحریکوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں مندرجہ ذیل خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔غلامی کے خاتمہ کی تحریک

۲۔نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک آزادی

۳۔مزدوروں کے حقوق کی تحریک

۴۔امریکی سیاہ فاموں کی مساوی حقوق کی تحریک

۵۔سول نافرمانی کی تحریک

۱۔غلامی کے خاتمہ کی تحریک:۔

تاریخی اعتبار سے حقوق کو تسلیم کروانے کی جدوجہد میں ایک ابتدائی کامیابی غلامی پر پابندی کا قانون بننا تھا۔غلامی کا سلسلہ چین کے شانگ شہنشاہوں (اٹھارہویں سے بارہویں صدی ق م) سے چلا اور بیسویں صدی تک جاری رہا۔حمورابی (بابل) قوانین کے مطابق مفرور اور جلاوطن غلاموں کو پناہ دینے والے کے لیے موت کی سزا مقرر تھی۔اسی طرح برصغیر کے بادشاہ منو نے سنسکرتی ضابطے لکھوائے جو دوسری صدی ق م اور دوسری صدی ب م کے دوران شاستر (قوانین) کہلائے۔ان قوانین سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلامی سماج میں ایک ادارہ بن چکی تھی۔

غلام کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ غلام انسان نہیں ہے اس کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے۔جسٹینین نے چھٹی صدی میں غلام کی تعریف کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ قوموں کے قوانین کے مطابق ہر وہ شخص جو فطرت کے اصولوں سے برعکس ہوگا وہ دوسروں کی ملکیت میں ہوگا۔غلام اپنے آقاؤں کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔زمانہ قدیم میں غلاموں کا استعمال گھریلو کام کاج، زرعی پیداوار اور زمین دوز کانوں میں ہوتا تھا۔ غلاموں کے فرار اور بغاوت کے واقعات عام تھے۔سلطنتِ روما اور یونانی تہذیبوں میں غلامی کو معیوب نہیں سمجھتا جاتا تھا۔عظیم یونانی فلاسفر ارسطو نے بھی غلامی کو تسلیم کیا مگر وہ اپنی ایک تقریر میں لکھتا ہے کہ ایسے فلاسفر بھی موجود ہیں جن کے نزدیک یہ فعل ایک نا انصافی اور فطرت کے اصولوں کے منافی ہے۔مگر رواقی فلاسفروں نے کبھی غلامی پر پابندی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔سلطنت روما میں پہلی اور دوسری صدی ق م سے غلام سستے اور عام دستیاب تھے۔غلامی کے ابتدائی دور میں بحری قزاق، اغوا کار اور بردہ فروش غیر ترقی یافتہ علاقوں سے انسانوں کو قید کر کے تجارتی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔سلطنتِ روما میں غلامی کو ناانصافی کے بجائے بدنصیبی سمجھا جاتا۔چین میں غلاموں کے استعمال کا رواج تو موجود تھا مگر غلاموں کی تجارت نہیں ہوتی تھی۔

دیگر ادوار میں براعظم ایشیا، یورپ، امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ میں غلاموں کی منڈیاں ہوتی تھی۔اُس دور میں اخلاقی سطح پر غلامی کی مذمت یا انسانی تجارت میں ملوث لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی جس سے یہ برائی پروان چڑھتی رہی۔انبیا نے لوگوں کو تلقین کی کہ غلاموں سے اچھا برتاؤ کیا جائے اور نیک عمل کے نتیجے میں غلاموں کو رہا کیا جائے۔سیاہ فام غلاموں کی بڑھتی مانگ کے پیش نظر افریقہ سے حبشی غلام بنا کر لائے جاتے تھے۔650ء سے 1950ء تک تقریباً اٹھارہ ملین افریقیوں کو انسانی تجارتی منڈیوں میں فروخت کیا گیا۔

17 اکتوبر 1482ء کو پوپ پائس دوئم نے پرتگالیوں کو انسانی تجارت جیسے مکروہ کاروبار کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا مگر بعدازاں 1517ء میں پروٹسٹنٹ فرقے کی تحریک اصلاح، کلیسا کے حصولِ قتدار کی کاوشیں اور دیگر دنیاوی معاملات میں بڑھتے رجحانات کی وجہ سے غلامی جیسی برائی کی مخالفت نہیں کی گئی۔یورپی باشندوں نے 1450ء سے لے کے 1868ء تک ستر لاکھ افریقیوں کو انسانی تجارت کے ذریعے امریکہ پہنچایا۔قرونِ وسطیٰ میں رعایا اور غلام دونوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی کیونکہ اس دور کے آقا (حاکم) ان دونوں کو کمتر اور حقیر گردانتے تھے۔رعایا اور غلاموں کا آقاؤں پر انحصار تیرھویں صدی تک جاری رہا۔غلامی جیسے غیر انسانی فعل سے نجات کی امید اس وقت پیدا ہوئی جب عالمی سطح پر معاشی تبدیلی، زرعی ترقی اور طاعون جیسی وباؤں نے جاگیرداری اور اجارہ داری کو مزارعت کا نظام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔اس دور میں

زراعت میں توسیع کا دارومدار غلاموں پر تھا۔اس کا آغاز سپین کے جنوبی امریکہ پر قبضے کے بعد ہوا۔ ہسپانوی باشندوں نے مقامی انڈین مزدوروں کو زرعی پیداوار کے لیے استعمال کرنا شروع کیا کیونکہ وہاں زمین خشک اور بنجر تھی۔کانوں میں کام کرنے والے انڈین لوگوں کی حالت زرعی غلاموں سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔اسی دور میں جنوبی امریکہ کے کچھ مذہبی رہنماؤں نے سولہویں صدی میں تجویز پیش کی کہ انڈین غلاموں کو سخت مشقت سے نجات دلانے کے لیے سیاہ فام افریقیوں کو کاشتکاری کے لیے درآمد کیا جائے کیونکہ سیاہ فام افریقی سخت جان سمجھے جاتے تھے۔

حبشی غلاموں کی تجارت کا آغاز کیریبین (ویسٹ انڈیز اور مشرقی سنٹرل امریکہ، شمالی جنوبی امریکہ کے درمیان) جزیرے سے ہوا اور جلد ہی یہ تجارت کئی اور جزیروں میں پھیل گئی۔ برطانوی علاقوں میں ان کی آمد سترہویں صدی اور اٹھارویں صدی تک جاری رہی جس کے نتیجے میں اٹھاوریں صدی کے آغاز میں غلاموں کی تعداد نو آبادکاروں سے تجاوز کر گئی۔غلامی کو زوال اس وقت شروع ہوا جب تمباکو کے بجائے کپاس کی پیداوار میں اضافہ ہوگیا۔

گویا زرعی ترقی مزدوروں اور غلاموں کے لئے سہولیات لائی۔غلاموں کی تجارت میں فرانسیسی، پرتگالیوں اور ولندیزی شامل تھے لیکن برطانوی باشندے اس کاروبار میں سب سے زیادہ ملوث رہے۔ 1860ء کی امریکی خانہ جنگی کے دوران 44,41,830 غلاموں کو شمار کئے گئے۔1671ء میں کوئیکرز یا فرینڈز آف سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس جماعت کا آغاز برطانیہ میں ہوا۔اس نے غلامی کے خاتمے کے لئے موثر تحریک شروع کر دی۔جس کے نتیجے میں اٹھاوریں صدی کے آخر تک امریکی معاشرے میں غلامی کو معیوب سمجھا جانے لگا اور غلامی کے خاتمے کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔امریکی انقلاب کے بانیوں نے غلامی کی مذمت کرتے ہوئے اس پر پابندی کا مطالبہ کیا۔شمالی امریکی ریاستوں نے غلامی پر پابندی عائد کی جبکہ زراعت پر انحصار ہونے کی وجہ سے جنوبی ریڈ انڈینز اور لاطینی امریکہ کے ممالک نے غلامی پر پابندی عائد نہیں کی۔

1787ء میں انسدادِ غلامی سوسائٹی قائم کی گئی جبکہ کوئیکرز کے ممبران اس سوسائٹی میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ 1807ء میں امریکہ اور برطانیہ نے انسانی تجارت پر پابندی عائد کی۔1833ء میں امریکہ میں اینٹی سلیوری سوسائٹی کا آغاز ہوا اور 1839ء میں یہ سوسائٹی برطانیہ میں قائم کی گئی۔امریکی خانہ جنگی کے دوران سیاہ فام جنگجوؤں کے کردار نے ایسی فضا ہموار کر دی کہ صدر ابراہام لنکن غلامی پر پابندی کے لئے عملی اقدامات کر پائے جس کے نتیجے میں امریکی آئین میں تیرھویں ترمیم (1863ء) آزادی کے فرمان کی صورت میں غلامی پر مکمل پابندی عائد کی گئی۔روس نے 1861ء میں زرعی غلاموں کو آزاد کیا۔ایشیا میں تھائی لینڈ کے بادشاہ نے 1874ء میں غلامی پر پابندی لگادی۔غلامی پر پہلی مرتبہ بین الاقوامی سطح پر پابندی 1814ء میں پیرس معاہدہ امن میں لگائی گئی۔لیگ آف نیشنز نے 1926ء میں ایک عالمی انسداد غلامی کنونشن (دستاویز) تیار کی اور جن ممالک نے اس معاہدے پر دستخط کیے انہوں نے عہد کیا کہ وہ فوری طور پر اپنے ممالک میں غلامی کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کریں گے۔انسداد غلامی کنونشن، کی اہمیت کے پیش نظر ایک اضافی کنونشن کو سماجی اقتصادی کونسل کے ذریعے پاس کیا گیا جس میں قرض کی ادائیگی نہ کرنے پر قید، بیگار کیمپ، دلہنوں کی خریداری اور بچوں کی مشقت پر بابندی لگائی گئی۔لیگ آف نیشنز نے مہاجرین کے مسائل کو بھی اٹھایا البتہ جبری مشقت کے معاملے کو آئی ایل او کے سپرد کر دیا گیا۔

1930ء میں آئی ایل او نے ایک کنونشن کے ذریعے جبری مشقت پر پابندی عائد کی۔جس کی رو سے جبری مشقت کی تعریف یوں کی گئی۔"کسی بھی شخص سے ایسی مشقت جو سزا کے طور پر دی جائے یا جس کے لئے وہ رضا کارانہ تیار نہ ہو جبری مشقت ہے" تاہم اس کنونشن میں جبری مشقت کی کئی شکلیں نظر انداز ہوگئیں۔نازی کیمپوں (جرمنی) میں قیدیوں سے ناروا سلوک کی شکایات عالمی سطح پر نمایاں ہوئیں تو جبری مشقت کا مسئلہ دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔جبری مشقت کو سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا، بعدازاں اس کو اقلیتوں بالخصوص یہودیوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔روسیوں اور جرمنوں نے جنگی قیدیوں کو بیگار کے لئے استعمال کیا۔پھر انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ آیا جس کے آرٹیکل 4 میں یہ اصول واضع کیا گیا ہے کہ کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا۔غلامی اور بردہ فروشی کی ہر شکل ممنوع ہوگی۔اقوام متحدہ نے 1956ء میں اپنے ضمنی کنونشن، بعنوان "غلامی پر پابندی" میں انسانی تجارت کی شدید مذمت کی۔آئی ایل او نے 1957ء میں اپنے ایک سو پانچویں کنونشن میں جبری مشقت کی مذمت کی تاہم دنیا کے کچھ حصوں میں آج بھی غلامی اور جبری مشقت کی کئی شکلیں پائی جاتی ہیں۔بعض ممالک میں فوجی مقاصد کے لئے جبری مشقت لی جاتی

ہے۔سعودی عرب میں غلامی کے خاتمے کے لئے 1963ء میں قانون تشکیل دیا گیا۔

۲۔نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک آزادی:۔

پندرہویں صدی کے آخر میں جغرافیائی حدود کی توسیع میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوا جس میں امیر اور ترقی یافتہ ممالک نے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں نو آبادیاتی نظام قائم کیا۔ ہسپانوی، پرتگالی، فرانسیسی، برطانوی، ولندیزی اور جرمنوں نے کئی نوآبادیاں قائم کیں۔سیسل جان روڑز جس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں روڈز سکالر شپ قائم کیا اس کا شمار نوآبادیات کے وکیلوں میں ہوتا ہے۔اس نے برٹش ساؤتھ افریقہ کمپنی کی بنیاد رکھی۔کیپ کالونی (جنوبی افریقہ) کے اس وزیراعظم کا کہنا تھا کہ انگلینڈ اور برطانیہ کی کمپنیاں دنیا کے غیر مہذب علاقوں میں نوآبادیاتی بستیاں قائم کریں۔نو آبادیاتی نظام کی تعریف میں اس کے الفاظ تھے۔

'نئی زمینوں کی تلاش جن کی مدد سے ہم سستے داموں خام مال حاصل کرسکیں اور ان کے ممالک میں میسر مزدوری سے فائدہ اٹھائیں، نوآبادکاروں کے مطابق ان نوآبادیاتی بستیوں پر حکومت قائم کرنے سے فیکٹریوں کی اضافی پیداوار کی کھپت ممکن ہوسکے گی۔یہ بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نوآبادکاروں کے پسماندہ علاقوں میں تسلط قائم کرنے کے مقاصد توسیع پسندانہ تھے۔جنوبی افریقہ نا صرف نوآبادیاتی نظام کا شکار تھا بلکہ رنگ نسل کی بنیاد پر کئے جانے والے امتیاز بھی مقامی آبادی پر لاد دیئے گئے اور مذہب کی من مانی تشریحات کی مدد سے ان کا جواز پیدا کرلیا گیا تاہم نسلی امتیاز کے خاتمے کے لئے جدوجہد جاری رہی۔نیلسن منڈیلا نے 28 سال کی اسیری سے رہائی کے بعد جمہوریت کی بحالی اور امتیازی سلوک کے خاتمے کو ممکن بنایا۔

فلپائن، جس کو ہسپانوی بادشاہ فلپ دوئم کی وفات کے بعد یہ نام دیا گیا، بر اعظم ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کی اولین مثال ہے۔تین سو تینتس (333) سال ہسپانیہ کے زیر تسلط گزارے پھر 12 جون 1898ء کو اسپین اور پھر امریکہ سے دوسری عالمی جنگ کے بعد مکمل آزادی حاصل ہوئی تاہم امریکی آئین کے مطابق 'امریکی شہری برابر حقوق رکھتے ہیں اور وہ فلپائنی عوام کے ساتھ مل قدرتی وسائل کو استعمال کریں گے۔

برصغیر میں نوآبادیاتی نظام کا آغاز 1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے ہوا۔جس نے 1857ء میں انڈین سپاہیوں کی بغاوت کے بعد پورے برصغیر میں اپنی حکومت قائم کرلی۔1885ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس نے ایک قوم پرست تحریک شروع کی۔پھر 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام الگ وطن کے حصول کے لئے نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔1886ء میں برما کو ہندوستان میں ایک صوبے کی حیثیت سے شامل کیا گیا پھر 1937ء میں الگ کردیا گیا۔مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو ہندوستان کی آزادی کے ہیرو جبکہ اونگ سان (Aung San) برما کے بانی ہیں۔ہندوستان اور پاکستان کو آزادی 14 اگست 1947ء کو ملی۔برما کو 4 جنوری 1948ء کو۔ایشیا کے ہر ملک کے اپنے قومی ہیرو ہیں جنہوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ان میں سے کچھ رہنماؤں نے آزادی کے حصول کی خاطر مسلح جدوجہد کا ذریعہ اپنایا تو بعض رہنماؤں نے عدم تشدد کی حکمت عملی کے ذریعہ بیرونی تسلط کا مقابلہ کیا۔

جاپان ایشیا کا واحد ملک ہے جس نے دیگر علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھا۔1853ء میں جاپان نے اردگرد کی کمزور ریاستوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی اور کوریا پر قبضہ کرنے کے بعد چین کا رُخ اختیار کیا۔جاپان نے صنعتی میدان میں تیز ترقی اور نوآبادکاری میں مغرب کی نقل کی۔جس کے نتیجے میں 95-1894ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ ہوئی، اس جنگ میں جاپان نے فتح حاصل کی اور مراعات حاصل کرلیں۔05-1904ء میں روس کو کوریا اور منچوریا کی جنگ میں شکست دینے کے بعد جاپان نے کوریا کو 1910ء میں اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔جاپانی عزائم کو روکنے کیلئے 1943ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران 'قاہرہ منشور' کے تحت امریکہ، برطانیہ اور چین نے مشترکہ معاہدہ کیا کہ کوریا کو آزادی دلائیں گے۔جنگ کے خاتمے پر جاپان نے 38 محاذوں پر سوویت یونین سے شکست تسلیم کی جس کے نتیجے میں کوریا دو حصول (شمالی اور جنوبی) میں تقسیم ہوگیا۔

۳۔سول نافرمانی کی تحریک:۔

عدم تشدد / سول نافرمانی کی تحریک کے سرکردہ لیڈروں میں موہن داس کرم چند گاھندی اور ان کے معنوی شاگرد ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کا نام سرفہرست آتا ہے۔عدم تشدد / سول نافرمانی کی تحریک نوآبادکار مہم جوؤں کے خلاف شروع کی گئی۔سول نافرمانی سے مراد قانونی حدود سرکاری احکامات کی خلاف ورزی کرنا اور حکومت سے مطالبات کی منظوری کے لئے پرامن دباؤ کا طریقہ کار اختیار کرنا ہے۔گاندھی جی نے عدم تشدد کے فلسفہ کو سیاسی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کیا۔گاندھی جی کا کہنا تھا کہ وہ لیو

ٹالسٹائی، ہنری ڈیوڈ تھریو، بھگوت گیتا اور بائبل کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔ لیو ٹالسٹائی کا شمار دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جبکہ تھریو ایک امریکن شاعر، فلاسفر اور تحریک آزادی کا محرک تھا۔ اس نے مزاحمت کے خیالات کو کتابی شکل میں 1849ء میں شائع کیا۔ ' سول نافرمانی کے عنوان کے تحت' اس کی کتاب A Yankee in Canada کے عنوان سے 1866ء میں شائع ہوئی۔

1906ء مین گاندھی جی نے ستیا گرہ کے فلسفہ (سچ کی طاقت طریقہ) کو ہندوستان کی آزادی کے لئے اور برطانوی سامراجی نظام کے خلاف استعمال کیا۔ آزادی کی جدوجہد میں ستیا گرہ نے سول نافرمانی اور بھوک ہڑتال کا طریقہ کار استعمال کیا۔ ماسٹر تا راسنگھ کو قوم کے حقوق تسلیم کروانے کی جدو جہد میں 1930ء سے 1966ء کے دوران 14 مرتبہ جیل جانا پڑا۔ گاندھی جی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے سکھ قوم کے حقوق کے حصول کی خاطر 48 دن مسلسل بھوک ہڑتال بھی کی۔

گاندھی جی کے قریبی ساتھیوں میں سے خان عبدالغفار خان (1890-1988ء) کو سرحدی گاندھی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بہادر پٹھان لیڈر تھے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے عدم تشدد پر مبنی قومی تعمیر و ترقی کی تحریک شروع کی، اس تحریک کو سرخ پوش تحریک کا نام دیا گیا۔ گاندھی جی کی طرح غفار خان نے بھی آزادی کی خاطر کئی سال جیل میں بسر کیے۔ وہ ہر دلعزیز رہنما اور عدم تشدد کے حامی تھے۔ انہوں نے عدم تشدد کی حامی ایک فوج تیار کی اور اس کا نام خدائی خدمت گار رکھا۔ یہ لوگ پٹھانوں میں تعلیم عام کرنے اور دیگر سماجی بھلائی کے کام اور انہیں تشدد سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے موقع پر ہندوؤں اور سکھوں کی جانیں بچانے کے لئے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی۔ 1924ء میں گاندھی جی کی عدم تشدد اور سول نافرمانی کی تحریک سے متاثر ہو کر انڈونیشیا کے ایک گروپ نے ولندیزیوں (ہالینڈ) سے آزادی حاصل کرنے کے لئے قوم پرستی کی تحریک شروع کی۔

۴۔ مساوی شہری کی تحریک:۔

اگرچہ امریکہ میں تیرھویں آئینی ترمیم کے ذریعے غلامی پر پابندی کے مطابق سیاہ فام امریکی آزاد شہری تھے۔ تاہم ان کے خلاف سماجی امتیاز اور ناانصافیوں کا سلسلہ بیسویں صدی تک جاری رہا۔ نسلی امتیاز کے خلاف مزاحمت نے 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں مساوی تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔

امریکہ میں 1875ء کے شہری حقوق ایکٹ کے مطابق رنگ، نسل اور مذہب کے امتیازات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر 1883ء تک یہ قانون حکمرانوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا۔ بعد کے کچھ قوانین میں امریکی سیاہ فام کے شہری حقوق غصب ہوئے۔ لہٰذا مساوی حقوق کا معاملہ بدستور کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ 1896ء کے کیس (Plessy Vs Ferguso) میں سپریم کورٹ نے ایک تاریخی فیصلے میں تفریق کے خاتمے اور برابری کے حقوق کے فیصلے کو برقرار رکھا اور بیسویں صدی کے نصف تک یہی صورتحال جاری رہی۔

1945ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر امریکی صدر ہیری ٹرومین نے امریکی فوج میں نسلی امتیاز کا خاتمہ کیا اور قانون سازی کے لئے نیشنل ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپلز نامی جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے امریکی انتظامیہ میں روشن خیالی کے رجحان کو مضبوط کیا۔ 1954ء میں امریکی سپریم کورٹ نے نسلی امتیازات پر مبنی نظام تعلیم کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ لیکن اس تحریک میں ایک زبردست ابھار اس وقت پیدا ہوا جب ایک سیاہ فام خاتون روزا پارکس نے 5 دسمبر 1955ء کو منٹگمری کے مقام پر بس میں سفید فام لوگوں کے لئے مخصوص حصے میں سیٹ لے لی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نسلی امتیاز پر کئی مہینوں احتجاج ہوا۔ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ (البامہ برمنگھم کے پادری) نے اس امتیازی سلوک پر اپنی پر جوش تقریروں کے ذریعے عوام میں ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ امریکہ میں نسلی امتیاز کے خاتمے کے مطالبے نے عوامی تحریک کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک کو سفید فام شہریوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔

ڈاکٹر کنگ نے مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تشدد، دھرنے، احتجاج، عوامی مارچ مظاہروں کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے سدرن کرسچن لیڈر شپ کانفرنس کے ذریعے انسانی حقوق کو تسلیم کروانے کے لئے احتجاجی تحریکوں کی قیادت کی۔ 1960ء میں طلباء کی جانب سے تھیٹروں، لائبریریوں، مارکیٹوں اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز سے امتیازی سلوک کے خاتمے کی جدوجہد میں احتجاجی دھرنے بھی شروع ہو گئے۔ اگست 1963ء میں واشنگٹن ڈی سی میں نسلی امتیاز کے خاتمے کے لئے دو لاکھ کے ہجوم نے احتجاج مظاہرہ کیا جس میں ڈاکٹر مارٹن لوتھر نے اپنی زندگی کی پر اثر اور یادگار تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک خواب ہے'' ان کا خواب تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے جب دنیا سے ناانصافی اور امتیازی سلوک کا خاتمہ ہو۔ اسی سال امن کے لئے خدمات کے صلے میں انہیں نوبل

انعام ملا۔1964ء میں امریکہ کا صدر لنڈن بی جانس نے امریکی تاریخ کے دور کے اس اثرات کے حامل شہری حقوق ایکٹ پر دستخط کئے ۔جس کی منظوری سے عام مقامات پر نسل، رنگ، مذہب اور علاقائی تعصب کا خاتمہ ممکن ہوا۔

1965ء میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں نسلی امتیاز کے خاتمے کا کنونیشن پاس ہوا جو 1969ء میں نافذ العمل ہوگیا۔اس کے نتیجے میں عام مقامات اور اداروں میں رائج امتیازی سلوک ختم ہوا۔ یہ 1958ء اور 1960ء میں منظور کردہ کنونیشن سے زیادہ موثر تھا۔قرارداد کے مطابق نسلی امتیاز کے خاتمے پر کام کو قانونی حیثیت حاصل تھی اور ان کے فرائض میں پسماندہ گروپوں کو ایکشن پروگرام کے تحت وسائل کی فراہمی اور ان کی ترقی ایجنڈے کا حصہ تھی۔

۵۔مزدوروں کے حقوق کی تحریک:۔

انیسوی صدی تک مزدور سرمایہ داروں (مل مالکان) کے رحم وکرم پر تھے۔ یہ عموماً آقا اور غلام جیسا رشتہ ہوتا تھا۔ 1830ء میں فرانس میں مزدوروں کے سماجی انصاف کے حصول کے لئے سوشل جسٹس نامی تحریک شروع کی گئی جس کے ساتھ ہی مزدور یونین کی تشکیل اور مشقت کے مقررہ اوقات کے لئے مظاہروں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ٹریڈ یونین کی تشکیل پر عائد کردہ پابندی کو 1824ء میں برطانیہ اور 1884ء میں فرانس میں ختم کیا گیا تاہم امریکہ میں عدالتی کاروائی کے ذریعے 1930ء تک یونین کی سرگرمیوں کو دبا دیا گیا۔مختلف ملکوں میں لیبر کے شعبے 1900ء کے آغاز میں قائم کیے گئے۔فرانس میں مزدوروں کے حقوق سے متعلق پہلا قانون 1901ء میں منظور کیا گیا۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد سے پہلے مشینری کم دستیاب اور خاصی مہنگی تھی جبکہ مزدوری سستی اور اوقات کار سے عاری انسانی مشقت قابل قبول سمجھی جاتی تھی۔اس لئے مشقت کے دورانیہ میں کمی کی مانگ کو سرمایہ داروں کی جانب سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ برطانیہ میں رائج لیبر قانون میں تبدیلی کر کے فیکٹریوں میں بچوں اور عورتوں کے لئے روزانہ 10 گھنٹے کام کا دورانیہ مقرر کیا گیا ۔ امریکہ میں کچھ ریاستی قوانین 1840ء اور 1850ء کے دوران پاس کئے گئے مگر 1870ء تک ان پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔روزانہ 8 گھنٹے کام کے دورانیہ کا رواج 1850ء میں آسٹریلیا میں پڑا۔امریکہ میں ایک عدالتی فیصلے کے نتیجے میں 1866ء میں روزانہ 8 گھنٹے کام کا دورانیہ اور یکم مئی کو مزدوروں کا دن منانے کی گنجائش پیدا ہوچکی تھی لیکن عملی طور پر اس کو پہلی عالمی جنگ کے بعد نافذ کیا گیا جس میں روزانہ 8 گھنٹے کا دورانیہ اور ہفتے میں 6 دن کام کے لئے مقرر کیے گئے۔ یہ نعمت یورپ کے مزدور طبقہ کو ایک صبر آزما جدوجہد کے بعد 1920ء میں نصیب ہوئی۔ ہفتے میں 40 گھنٹے کام کو سب سے پہلے 1936ء میں فرانس میں اختیار کیا گیا اور 1938ء کو امریکہ میں اس طریقہ کار کو متعارف کروایا گیا۔

ہندوستان میں منو کے کئی قوانین مزدور اور انتظامیہ کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں۔لیکن مزدوروں کے حقوق پر قانون سازی اٹھاوریں اور انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کی مرہون منت ہے۔روشن خیالی کی اس تہذیب میں جدید سماجی اور اخلاقی نشو ونما کے ساتھ ساتھ عالمی معیارات سے ہم آہنگ نئی قانون سازی کی گئی ۔ پہلی مزدور دوست قانون سازی 1802ء میں برطانیہ میں ہوئی ۔1848ء میں سوئیٹزرلینڈ نے بچوں کی مشقت پر پابندی سے متعلق قانون پاس کیا۔ بیماری کی انشورنس اور ہرجانے کو سب سے پہلے جرمنی میں 84-1883ء میں تسلیم کیا گیا۔پہلی عالمی جنگ کے بعد مزدوروں کے لئے قانون سازی میں تیزی آئی اور 1929ء میں امریکہ میں صنعتی مسائل نے ان کی منظوری میں مدد دی۔روس میں کنونیشن 1919ء میں پاس کیا گیا۔

اگر اقلیت عوام کی راہنمائی کرنے اور ان سے قریبی رابطہ قائم رکھنے میں ناکام ہوتی تو ہم اسے پارٹی کا نام نہیں دے سکتے کیونکہ عمومی طور پر یہ تنظیم ایک بیکار محض ہوگی چاہے وہ خود کو پارٹی کا نام دیتی رہے۔۔۔۔

☆☆☆ لینن ☆☆☆

تاریخ اور جنگ

اشفاق سلیم مرزا

جنگ ایک ایسا موضوع اور تعقل ہے جس کو عمومی طور پر منفی معنی پہنائے جاتے ہیں۔لیکن مطالعہء تاریخ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اب تک جو کچھ بیتا ہے جنگ اُس میں ایک ناگزیر اہمیت کی حامل ہے۔

جنگ کے بعد اُس کی ہولناکیوں، تباہ کاریوں اور انسانی جانوں کے ضیاع پر تو سب نوحہ کناں ہوتے ہیں۔لیکن ساتھ ساتھ جنگی کامرانیوں کے شادیانے اور طبل بجائے جاتے ہیں اکلیز (Achilles) سکندر، جولیس سیزر(Julius Cesear)، خالد بن ولید اور نپولین کی بہادری اور کامرانیوں کے گیت گائے جاتے ہیں۔اپنے اپنے حوالوں سے اُن کے نام تاریخ کے نصابوں میں سنہرے حروف سے لکھے جاتے ہیں۔ہمارے خطے کی دو بڑی رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت جنگوں کی کہانیاں رقم کرتی ہیں۔رِگ وید میں بیان کردہ، دریائے راوی کے کنارے لڑی جانے والی لڑائی دس راجن یدھ(battle of Ten Kings) بھی ایسی ہی ایک داستان ہے۔الغرض دنیا کا اولین ادبِ عالیہ رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے۔رامائن اور بھارت کا تو میں ذکر پہلے کر چکا ہوں اُن میں آپ ہومر(Homer) کی ایلیڈ(Illiad) بھی شامل کرلیں جو یورپی ادب کا باب اول تصور کی جاتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آئندہ لمحات اور صفحات میں جو بات کی جائے وہ دنیا بھر میں اور پاکستان میں قائم امن کی انجمنوں اور پرچاروں کو ناگوار گذرے۔لیکن میں وہ سب کہنے کو اختیار رکھتا ہوں جو میں نے تاریخ سے سیکھا ہے اور جو دنیا کے نامور نظریہ دانوں نے اپنے مکاتب فکر کے حوالوں سے بیان کیا ہے یعنی امن دو جنگوں کے درمیان وقفے کا دورانیہ ہے۔

(Peace is an interlude between two wars)

یونانی فلسفی ہراکلی ٹس (Heraclitus 475-335BC) ایک ایسا فلسفی ہے جسے ہیگل (Hegel) مارکس (Marx) نیٹشے (Nietzsche) کے علاوہ لینن (Lenin) نے بھی سراہا ہے۔جنگ جسے عربی زبان میں جدل کہتے ہیں، اُس کے فلسفے کا بنیادی نقطہ ہے۔تاریخ فلسفہ کے بہت سے ناقدین اُسے اولین جدلیاتی اور تغیراتی تعقلات کا بانی سمجھتے ہیں۔وہ کہا کرتا تھا کہ کسی شے کی پیدائش ہی اُس کی تخریب ہے اور تخریب ہی پیدائش ہے۔ہیگل نے اپنے تیئں اُسے یوں بیان کیا کہ ''کسی شے کی پیدائش کا لمحہ ہی اُس کی موت کا لمحہ ہے''(Hegel 1976.129) ہراکلی ٹس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر شے اجتماع ضدین(Unity of Opposites) ہے اور یہ کہ ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی اور اجتماع ضدین ہی دنیا کے وجود کو واجب بناتی ہے۔دوسرے آج کے معنوں میں وہ(Conflict) کی بات کر رہا تھا۔اس نقطہ نظر کی بازگشت بعد ازاں ہیگل اور خصوصاً مارکس کے فلسفہ جدلیاتی مادیت میں زیادہ مربوط پر سائنسی بنیادوں پر استوار ہوئی۔

پھر ہو کہتا ہے کہ جنگ سب کی جدّ ہے اور سب کی حکمران(War is the father of all and king of all) اگر ہم اس کی تشریح کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدل انسانی زندگی کے فروغ اور نشوونما کی کلید ہے اور تاریخ کی اس کشمکش میں جس نے قائم رہنا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے اور جس نے مٹنا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔اس قائم رہنے اور مٹنے میں کسی نوحہ گری، ماتم گُساری یا اخلاقی فرمان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، تاریخ ان تمام کمزور ڈھالوں کو روند کر آگے نکل جاتی ہے۔آپ بھلے سینکڑوں سال نوحہ کناں ہیں یہ نوحہ گری آپ کو عصری طاقتوں کی صف اول میں جگہ نہیں دے سکتی۔بے چارگی اور مظلومیت تاریخ کی نظروں میں مستحسن نہیں ہے۔اس کے اپنے اصول ہیں جو آسمان کی طرف منہ کرکے آہ بکا کرنے سے حاصل نہیں ہوتے۔

جنگ نے تاریخ میں جن قدروں کو آگے بڑھایا جو تغیر و تبدل برپا کیا اُس کی چند مثالیں مہابھارت، ایلیڈ، اعظم اور نپولینائی (Neopoleanic) جنگوں کی مثالوں سے واضح کرنے کی یہاں کوشش کی جائے گی۔

مہابھارت اُس کی پہلی مثال ہے اور دیکھتے ہیں کہ کرشن اور ارجن کے درمیان جو مکالمہ ہوا اور اُس کے جو اثرات مرتب ہوئے اُس کی تاریخ میں کیسے پذیرائی ہوئی۔

کرشن کا ارجن کے ساتھ یہ مکالمہ جو ایک درس کی شکل میں ہے۔بھگوت گیتا کہتا ہے اور

آج زندگی کا پہیہ گھمانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے اُن کے حصول کے لئے دنیا کے مختلف حصوں میں جنگ جاری رکھی جارہی ہے۔ہم اُن جنگوں کو کتنے ہی نظریات کا لبادہ کیوں نہ پہنائیں یا پھر اخلاقی ڈھالوں کا سہارا لیں۔بات اُن تین بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مسلط کی جاتی ہے اور تاریخ کے زیادہ تر ادوار میں اسی کا سورج چمکنا ہے۔

کبھی صرف گیتا ہی کہتا ہے۔ عام طور پر اُسے گیتا ہی کہا جاتا ہے اور جو کوئی گیتا پڑھتا ہے عمومی طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ گیتا کا پاٹ کر رہا ہے۔ ایک عام رائے کے مطابق اس کا مصنف ویاس ہی بتایا جاتا ہے۔

مہابھارت جنگ سے پہلے ارجن اپنے ہی خونی رشتوں سے جنگ کرنے سے ہچکچا رہا ہے اور کرشن اُسے جنگ کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ کرشن ایسا کہنے پر راستی میں پناہ لے رہا ہے اور بار بار اس بات کی تلقین کر رہا ہے کہ اگر تو راستی پر ہے تو جنگ تم پر عین فرض ہے۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے ارجن، کرشن سے جو اُس کے رتھ بان کے روپ میں ہے کہتا ہے اپنے ہی خون بھائیوں کو جنگ کے لئے تیار دیکھ کر میرے اعضاء مضمحل ہو رہے ہیں او رمیرا منہ خشک ہو رہا ہے۔ میرا جسم کانپ رہا ہے اور میرا دماغ گھوم رہا ہے میں بُرے شگون دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے ہی کنبے کے افراد کو قتل کرنے میں کوئی خیر دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے فتح کی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی میں اقتدار چاہتا ہوں اور نہ نشاط وراحت۔ میں یہ سب نہیں چاہتا میں اپنے بھائیوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔ (Muller Vol.III, 1965.40) ارجن کی بات سُن کر جہاں کرشن جسم اور روح کی بقاء کا فلسفہ پیش کرتا ہے وہاں یہ بھی کہتا ہے ''اے ارجن تو کھشتری ہے دھرم کی خاطر یدھ کرنا تیرا عین دھرم ہے تو اپنا فرض پہچان تمہیں اس وقت بالکل ہچکچانا نہیں چاہئے کیونکہ کھشتری کے لئے دھرم یدھ سے بڑھ کر کوئی عمل اطمینان بخش نہیں ہے اس لئے یدھ (جنگ) میں ڈٹ جا۔''

'' اے ارجن اگر تو اس یدھ میں مارا گیا تو سورگ پائے گا۔ اگر جیت گیا تو زمین پر راج کرے گا، اس لئے لڑنے کا ارادہ کر کے تو کھڑا ہو جا، دونوں ہی صورتوں میں تیری بہتری ہے۔'' پھر کہتا ہے۔ ''دھرم یدھ کرنے والے کے لئے دکھ، سکھ، نفع، نقصان، ہار جیت مساوی ہیں۔ جیت سے وہ پھولتا نہیں اور ہار سے مایوس نہیں ہوتا۔ اُسے ہار جیت سے کوئی سروکار نہیں راستی کے لئے موت آنا اس کے لئے حیات جاوداں ہے۔''

جیسا کہ ظاہر ہے کہ جنگ میں دونوں فریق اپنے اپنے طور پر راستی کیلئے لڑ رہے ہوتے ہیں اس لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اور تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ یہاں میں ہندوستان کے دور مورّخین کے حوالے دینا چاہوں گا۔ رومیلا تھاپر (Romilla Thapar) کہتی ہے جہاں رتھ بان کے طور پر کرشن ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتا ہے وہاں اگر گوتم بدھ رتھ بان ہوتا تو اُس کا پیغام اُس سے بالکل مختلف ہوتا (Thapar.2002.218)۔ لیکن ڈی ڈی کوسامبی (D.D. Kosambi) کرشن کے لئے خیر کا کوئی کلمہ نہیں نکالتا۔ وہ کہتا ہے کہ اخلاقی اقدار کے حوالے سے کرشن نے کوئی اچھا سبق نہیں دیا۔ پھر کہتا ہے کہ اُس کی تلقین کردہ کسی بھی اخلاقیات پر بمشکل ہی اعتماد پیدا ہو سکتا ہے۔ (Kosambi. 1985. 206)

میں اس بات پر حیران ہوں کہ کوسامبی تاریخی مادیت کے قریب ہوتے ہوئے بھی کرشن کی اخلاقیات کو سوالیہ نشان بنا رہا ہے۔ میں یہاں صرف اُس حصے کو زیر بحث لا رہا ہوں جو ارجن کے ساتھ جنگ کے بارے میں مکالمے کی شکل میں ہے۔ کرشن کے درس کا یہ حصہ اپنے تاریخی بُعد کو ایک طرف رکھتے ہوئے نٹشے کے '' Thus Spake Zara Thusta'' اور زرتشت سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔

یورپی کلاسیکی ادب کی شاہکار رزمیہ نظم ایلیڈ (Illiad) جو مر سے منسوب ہے (یہ الگ بات ہے کہ اُس کے مصنف اور وقت کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں) اپنے متن کے حوالے سے خونچکاں داستانِ الم ہے۔ ایلیڈ جس کے سادہ الفاظ میں معنیٰ ہیں ٹرائے کے بارے میں شاعری اپنے تئیں خون، قتل گری سطوت اور غم والم سے عبارت ہے۔ (Baldry . 1951. 51) بظاہر اس نظم میں ایک عورت کے لئے مشرق کے ایک عظیم شہر کو نیست ونابود کر دیتا ہے۔ لیکن سورماؤں کی شجاعت، دلیری اور خون ریزی کی داستان بھی رقم کرتی ہے۔ گویہ سب کچھ انسانوں نے دیوتاؤں سے منسوب کر دیا۔ لیکن یہ دس سالہ لڑائی، جنگ کی برتری کو مسند پر سجاتی ہے۔ گو یوریڈیز (Euripides) کے ڈرامے ٹرائے کی عورتیں (Trojan Woman) میں نوحہ گری کا عنصر بھی شامل ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عمومی طور پر یونانی کلاسیکی ادب میں غارت گری اور فتح کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ قتال کے بارے میں ایلیڈ ہی میں اکلیز (Achilles) اور ہیکٹر (Hector) کے درمیان ہونے والا مکالمہ جنگ کے حق میں تاریخی حقیقت نگاری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اکلیز آخری دنوں میں ہیکٹر سے لڑتے ہوئے غضب ناک انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔

'' ہیکٹر میں تم سے صلح کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، تم ہر بات کو جلدی بھولنے والے ہو۔ کیونکہ شیروں اور انسانوں کے درمیان صلح کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

یاد رکھو بھیڑیوں اور بھیڑوں کے درمیان صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے قابلِ نفرت ہیں۔ اس لئے ہمارے درمیان بھی کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ ہم میں سے ایک خاک میں نہیں مل جاتا۔'' (Homer,1984, 388)

تھیوسی ڈائٹس (Thusidides) نے بھی اس بات کی توثیق واضح الفاظ میں کی ہے۔ جب یونانیوں نے جزیرہ میلوس پر چڑھائی کی اور قتل وغارت سے پہلے اہل یونان اور میلوس کے باشندواں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی کہ جنگ کو روکا جا سکے تو یونان کے معتبرین اہل میلوس (Melos) سے یوں گویا ہوئے۔

'' آپ اور ہم عملی طور پر یہ جانتے ہیں کہ انصاف کا سوال اُن دو متحارب گروہوں میں

ہوتا ہے جو عسکری قوت کے بل بوتے پر ہم پلّہ ہوں اگر ایسا نہ ہو تو طاقت ور وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور کمزور کو زیر ہونا ہوتا ہے۔''

بالآخر اہل میلوس کے سب جوانوں کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔(Thucydides.1968,267-273) فینلے (Finley) کے نزدیک جنگ یونانیوں کی زندگی کا روزمرہ کا معمول تھا۔حتیٰ کہ افلاطون نے اپنی کتاب قوانین (Laws) کا آغاز ہی اس بات سے کیا تھا۔وہ کریٹ کے ایک پرانے قانون ساز کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو کس طرح جنگ کیلئے تیار رکھتا تھا اور یہ کہ زندگی بھر ایک شہری ریاست کو دوسری شہری ریاستوں کے خلاف نبرد آزما رہنا ہے۔

اس لئے جنگ یونانیوں کی پالیسی سازی کا حصہ تھی جسے یونانیوں نے بارہا استعمال کیا۔(Finley,1963.63)

اس سلسلے میں یونان کی مثال اُس کی دوسری ریاستوں بالخصوص سپارٹا کے حوالے سے واضح کرنا ہوگی جس کا آئین ہی شہریوں کو جنگ کیلئے تیار کرنے کے گرد مرتکز تھا۔

یہ آئین لیکرگس کرگس (Dorians) نسل کے لوگ آباد تھے شمال سے آکر انہوں نے جنوبی پیلوپونی سوس (Peloponeseus) پر قبضہ کرلیا تھا۔ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ شمال سے آئے ہوئے ان لمبے بالوں والے سخت جان پہاڑی باشندوں کا مطمع نظر سوائے جنگ اور غلامی کے کچھ نہ تھا اور یہی زندگی گذارنے کے لئے اُن کے لئے صحیح راستہ تھا۔ یہ بھی کہ یہاں پر بسنے والے زراعت پیشہ پُر امن شہریوں کو زندگی کو آگے بڑھانے کیلئے آقاؤں کی بھی ضرورت تھی۔

یونان میں جہاں بہت سی روایات بھاٹوں کے منہ سے نکل کر تاریخ دانوں کے قلم سے مستند ہوئیں اُن میں جنگ ٹرائے کو تاریخ کا لبادہ پہنانے کے ساتھ ہیروڈوٹس نے لائی کرگس کی رومانی اساطیری شخصیت کو حقیقت کا روپ دے دیا۔سپارٹا کی زندگی کے بنیادی ارکان میں جنگی تربیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی،عسکری تربیت ہر شہری کے لئے لازم تھی اور بیس سال کی عمر سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک اُسے فوجی خدمات کے لئے خود کو تیار رکھنا ہوتا تھا۔

سکندر اعظم یونان کے شمال میں مقدونیہ کی چھوٹی سی ریاست سے باہر نکلا۔ گووہ اصلاً یونانی نہیں تھا۔ پھر بھی اُس کی آبیاری یونان کے مرکزی شہر ایتھنز (Athem) سے ہوئی تھی اور اُسے ارسطو جیسا باکمال اُستاد ملا تھا اور اُس کی افواج یونانی تہذیب و تمدن کو اپنے دوش پر اُٹھائے ہوئے تھیں اس لئے حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مفتوحہ علاقوں میں اُس کے اثرات بھی چھوڑتے گئیں ۔سکندر جہاں سے بھی گذرا یونانی تہذیب وثقافت کے بیج بوتا گیا۔ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ اُس کی رگوں میں اپنے باپ فلپ کی طرف سے ملی ہوئی توانائی اور اولمپیا سے حاصل کی ہوئی وحشیانہ شدت تھی ۔ اولمپیائی باشندے اپنا رشتہ اکلیز (Achilles) سے جوڑتے تھے۔اس کی ماں اولمپیاس کا بھی یہی موقف تھا۔اس لئے جب ایلیڈ(Illiad) کا وہ شیدائی تھا جب اُس نے ہیلس پونت(Hellespon) کو پار کیا تو اُس کے مطابق وہ اکلیز کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور جب وہ ایشائی ساحلوں پر اُترا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے آبادواجداد نے جو کام ٹرائے (Troy) سے شروع کیا تھا وہ اُسے تکمیل کر رہا ہے۔اپنی تمام مہموں کے دوران وہ ایلیڈ کا وہ نسخہ جسے ارسطو نے تدوین کیا تھا اپنے سرہانے رکھتا تھا جس کے پہلو میں ایک خنجر رکھا ہوتا تھا جو آلہ کار اور منزل کی علامت تھے۔ (Durant.1966.part.III.538)

پلوٹارک کے کہنے کے مطابق اُسے علم حاصل کرنے کی شدید پیاس تھی۔وہ مختلف علوم میں دلچسپی رکھتا تھا وہ دن بھر سفر کرنے یا برسرپیکار رہنے کے بعد آدھی آدھی رات تک عالموں اور سائنس دانوں سے بحث ومباحثہ کرتا تھا۔شاید ارسطو کے مشورے سے ہی اُس نے دریائے نیل کے ماخذ اور منبع کو دریافت کرنے کیلئے ایک مہم روانہ کی تھی۔ جو علم جغرافیہ کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔

جب ہندوستان آیا تھا تو ٹیکسلا کے قریب ہندو جوگیوں کے ساتھ اُس کے مکالمے تاریخ دانوں نے درج کئے ہیں۔اس طرح جنگ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ جہاں اور بہت سے اثرات لے کر جاتی ہے۔وہاں علم کے ساتھ ساتھ نسلی ملاپ سے پیدا ہونے والے بچوں کے روپ میں دو تہذیبوں میں مانین ہم آہنگی کو ختم دیتی ہے۔ایران میں آکر یونانیوں نے بے شمار ایرانی عورتوں سے بچے پیدا کئے اور اُن کے اختلاط سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی۔

یہی حال ہندوستان میں بھی ہوا۔کہا جاتا ہے اُس نے اپنے ایک بحریہ کے افسر کو تارک الدنیا برہمنوں سے مکالمہ کرنے کے لئے بھیجا۔جیسا کہ یحییٰ امجد نے لکھا ہے اُس نے دو برہمنوں کو کھانے پر بلایا اور ایک کو بطور فلسفی ملازم بھی رکھ لیا۔ یونانی ان جوگیوں یا برہمنوں کو جمنو سوفسطائیوں (Gymno Sophists) کے نام سے یاد کرتے تھے اُن میں سب سے قابل ذکر کلانوس (Kalanos) تھا جو سکندر کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ سکندر اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پلوٹارک کے مطابق اُس کا اصل نام سفینز (Sphines) تھا لیکن یونانی اُسے (Kalanos) کلانوس کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسی طرح ایک اور ہندی سوفسطائی کا ذکر ہے جسے مانند ایز (Mendanes) کہا جاتا ہے۔اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کھلی چراگاہوں میں جن میں یونانی چلتے تھے تو یہ ان کے قدموں کے نشانوں پر اپنا پاؤں رکھ دیتے تھے جب سکندر نے یہ پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ سکندر تم جو ایک غاصب کے طور پر ہمارے ملک پر قبضہ کرنے آئے ہو مرنے کے بعد تمہیں صرف

اتنی ہی جگہ میسر آئے گی۔جتنی کہ ہر ایک کو ملتی ہے۔(Arrian (VIII.I.S.III)
Mcrindle . 1992.336-337)

اپنی جنگوں مہموں کے درمیان سکندر جہاں کہیں بھی گیا اُس نے وہاں اپنے تئیں نہ صرف سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں کیں جو تہذیبی ترقی کی نمائندہ تھیں بلکہ نئے شہر بھی بسائے۔ اکثر شہروں کا نام بھی سکندر کے حوالے سے سکندریہ (Alexendria) رکھا گیا تھا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سکندریہ نامی ایک شہر اُس نے افغانستان میں بامیان کے آس پاس بنایا تھا۔لیکن یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کی اصل جگہ باختر جانے والے راستوں کے سنگم پر تھی جو'' چری کر'' گاؤں کے پاس ہے۔اسی طرح نکانا(Nikaia) کا شہر بھی بگرام کے میدانی علاقے میں بنایا گیا تھا۔یونانی زبان میں نکایا کا مطلب ہے فاتح (Victorious)۔مصر کی مشہور بندرگاہ اسکندریہ کی بھی سکندر سے یہی نسبت ہے۔

اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے یونانی ریاستوں کی طرف رخ کیا۔ تھیبیس (Thebes) کو زیر کرنے کے بعد وہ ایتھنز پہنچا اور وہاں آکر آمریت کے خاتمے کا علان کیا اور کہا کہ تمام شہر اپنے قوانین کے تحت آزاد زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ علم کا قدردان تھا۔تھیبیس کو تخت وتاراج کرنے سے پہلے اس نے یہ حکم جاری کیا کہ پندار(Pindar) کے گھر کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

بہت سے تاریخ نویس اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ 1789 کا انقلاب تاریخ کا ایسا روشن باب ہے کہ جس میں فرانس کے اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے (Bourgeoise Class) نے باقی پسے ہوئے طبقات کی مدد سے جاگیردارانہ اشرافیہ اور اُس کا فیصلہ ایک جدل کے ذریعے ہوا تھا جہاں اُبھرتے ہوئے نئے پیداواری رشتوں نے اُن عوامل کو جنم دیا جنہوں نے سماج کی کایا پلٹ دی جیسا کہ ہربرٹ مارکوز (Herbert Marcuse) نے کہا ہے کہ فرانسیسی انقلاب کے نظریات نے اپنا مسکن صنعتی سرمایہ داری کی عمل پذیری میں ڈھونڈا۔(Marcuse.1977.4)

سہ مسلح نئے طبقات نے پرانے فرسودہ نظام کو شکست دی نہ صرف یہ بلکہ پورے یورپ میں اس ارتعاش کو محسوس کیا گیا اور جگہ جگہ زندگی نئی ڈگر پر چل پڑی۔سکندر کے حملے کے بعد ہمیں یونانی تہذیب کے اثرات ہر خطے میں ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں گندھارا تہذیب میں اُس کی نشانیاں باقی ہیں۔

نپولین کی افواج اور روشن خیالی نے مشرق کی طرف ایسی پیش قدمی کی کہ سماج بدل ڈالا۔ اگر مارکس کے الفاظ میں بیان کروں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جو بڑی تبدیلیاں یا انقلابات یورپ میں آئے ان کے بارے میں مارکس کا کہنا ہے۔ ''1648 اور 1789 کے انقلابات فقط برطانوی یا فرانسیسی انقلاب نہ تھے بلکہ وہ یورپی سطح کے انقلاب تھے۔وہ پرانے سیاسی نظام کا اعلان تھے۔ان انقلابوں میں جیت سرمایہ داروں کی ہوئی لیکن اُس وقت سرمایہ داروں کی جیت صوبائیت پر، مسابقت کی جیت گلڈ(Guild) پر، جائیداد کے بٹوارے کی جیت اولادِ کبریٰ کے حق موروثیت پر، زمین کے مالک کی جیت زمین کے غلبے پر، روشن خیالی کی جیت توہم پرستی پر، خاندان کی جیت خاندان کے نام ونمود پر، کسب وجدوجہد کی جیت سورمائی کاہلی پر، ملکی قانون کی جیت قرون وسطیٰ کی مراعات پر، 1648 کا انقلاب سولہویں صدی پر سترہویں صدی کی جیت تھا۔ 1979 کا انقلاب سترہویں صدی پر اٹھارہویں صدی کی جیت تھا۔ یہ انقلاب اپنے عہد کی دنیا کی ضرورتوں کا اظہار تھے نہ کہ اُن علاقوں۔۔۔۔۔برطانیہ اور فرانس کی ضرورتوں کا اظہار، جہاں وہ برپا ہوئے تھے۔
(Marx and Engels 1973,Vol.I,139-140)

فرانس میں جو تبدیلیاں آئیں وہ تو آئیں لیکن میں یہاں خصوصی طور پر جرمن ریاستوں میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔جیسا کہ ظاہر ہے کہ جرمنی اُس وقت معاشی ترقی میں فرانس اور انگلینڈ سے بہت پیچھے تھا۔سیاسی تقسیم کے حوالے سے 350 چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اگر کوئی درمیانہ یا بورژوا طبقہ تھا بھی تو بکھرا ہوا تھا اُن میں ہم آہنگی کا فقدان تھا۔مختلف علاقوں میں مختلف معاشی معیار اور نظام لاگو تھے۔محصول اور جنگ کے مختلف نرخ اور شرح ہر جگہ تجارت میں مختلف انداز میں رکاوٹ کا باعث تھے۔ ہیگل، جسے اختیار(Freedom) کہا ہے وہ عمومی طور پر وہاں کے باشندوں کو حاصل نہ تھا۔شخصی آزادی کا وہ دور یعنی محنت کو بیچنے کا اختیار صرف صنعتی دور سے شروع ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ دور میں یہ محنت جنس(Commodity) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

نپولین کی جرمنی پر یلغار کے بعد وہاں عقل پرستوں اور افروزوں نے نپولین کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہا۔عقل کے بارے ان ترجیحات نے خردمندی کے تحت اختیار کو استعمال کرنے اور مادی روپ کو بہتر بنانے کے رویئے کو ختم دیا اور جب یہ سب رویئے مادی روپ میں ڈھلے تو جرمن ریاستوں کا منفرد پن اور علاقائی پن ڈھیلے پڑ گئے اور قومی ریاست کی طرف سفر شروع ہوگیا۔ جو ایک نئے اختیار کی طرف پہلا قدم تھا اور دنیا نے دیکھا کہ جرمنی ایک قومی ریاست کے طور پر اُبھرنا شروع ہوگیا۔

تاریخ کا یہ سب سے بڑا انقلاب صرف اُس جنگ کی وجہ سے ہوا جو فرانس کے مختلف طبقات کے مابین ہوئی اور بعدازاں نپولین اُسے یورپ کی دوسری سرحدوں تک لے گیا۔ یہاں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ جرمنی میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں اُس سے پہلے جرمن فکر فرانسیسی مفکروں اور انقلاب کے زیر اثر آ گیا تھا۔ ڈیکارٹ (Descartes) تو ایک طرف ہیگل جیسا عظیم فلسفی اولین دور میں روبز پیر (Robespierre) کے خیالات سے بھی متاثر تھا۔

روبز پیر نے کہا تھا کہ اپنی قوت کے بل بوتے پر عقل کی سماجی نامعقولیت پر فتح ہوگی اور

دنیا کے ظالموں کو اکھاڑ پھینکے گی پھر سچ کے سامنے تمام جھوٹ غائب ہو جائے گا اور عقل کے سامنے تمام بے عقلی دم توڑ دے گی۔ ہیگل بھی اُس کی طرح عقل کی ناقابل تسخیر قوت پر یقین رکھتا تھا۔ ہیگل نے اس کے تتبع میں کہا یہ خصوصیت جسے انسان نے خود اپنا کہا ہے انحطاط پذیری اور موت سے ماوراء ہے۔ یہ خود وضع کرتی ہے یہ زمین اور آسمان میں کسی خارجی مقتدرہ ادارے سے کچھ حاصل نہیں کرتی۔(Mercuse. 1977.4.5)

ہیگل نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''فلسفہء تاریخ'' میں جن تاریخ ساز شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہ سب اعلیٰ پائے کے عسکری دماغ تھے جو جنگ کو اپنے علاقوں سے لے کر دوسرے ملکوں تک لے گئے اور ساتھ ایک بہتر تہذیب کے بہترین رنگ بھی اُن میں بکھیر گئے۔ اُن میں وہ سکندر، جولیس سیزر اور نپولین کا نام لیتا ہے۔ جن کی فوجوں کے ساتھ یونان، روم اور فرانس کا تہذیبی ورثہ بھی اُن کے ساتھ گیا۔ مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کی تاریخ پر ان جنگوں تاریخ ساز شخصیات کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ کسی سے پنہاں نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جنگ اور تاریخ کے درمیان جو رشتہ ہے اُس کو زیادہ واضح طور پر پیش کرنے میں، میں نے جو حوالے دیئے ہیں وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ جنگ اپنی محرکات کی وجہ سے تاریخ پر نہ صرف گہرے اثرات چھوڑتی ہے بلکہ اُس کو آگے بڑھانے میں مدد ومعاون ثابت ہوتی۔

طاقت اور جنگ کے بارے میں بعدازاں جرمن فلسفی (Nietzsche) نتشے نے جو اضافے کئے ان پر مباحث کے کئی نئے باب کھل سکتے ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں جو جغرافیائی، انتظامی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں صرف اُن کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا جو جدید تاریخ کا شاندار باب ہیں اُن لوگوں کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔

آخر میں جنگ تاریخ پر جو اثرات مرتب کرتی ہے چند نقاط میں اُس کا مختصر ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

1۔ تاریخ کے مطالعے سے میں نے یہ اخذ کیا ہے کہ دنیا بھر کی تاریخ طاقت اور جنگ سے عبارت ہے اور یہی بات تاریخ کے صفحات پر چھائی رہی ہے۔

2۔ لیکن اس طاقت اور جنگ کو کسی نظام کا روپ دینے یا اُس میں ڈھالنے کے لئے دساتیر یا آئین بھی متوازی سطح پر مرتب کئے گئے جوان کو باعمل اور بامعنی بنانے کے لئے تھے۔

3۔ جہاں ہم اکلیز، الگا میمون، سکندر، جولیس سیزر، اٹیلا، کرشن، اندر، چنگیز خان، امیر تیمور اور نپولین کی کہانی دہراتے ہیں تو ساتھ ساتھ ہم حمورابی، تھیسیس (Thesus) سولن، چنگیز خانی یاسا اور اکسٹس نپولین کے تغیرات کی بات کرتے ہیں جو اُن کو استحکام بخشنے اور سہارا دینے کے لئے بنائے گئے تھے۔

4۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنگ کہیں خلا سے اتری تھی۔ بلکہ خوراک، رہائش اور جنس کی ضرورتیں پورا کرنے کیلئے بروئے کار لائی گئی تھی، اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

آج زندگی کا پہیہ گھمانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے اُن کے حصول کے لئے دنیا کے مختلف حصوں میں جنگ جاری رکھی جا رہی ہے۔ ہم اُن جنگوں کو کتنے ہی نظریات کا لبادہ کیوں نہ پہنائیں یا پھر اخلاقی ڈھالوں کا سہارا لیں۔ بات اُن تین بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مسلط کی جاتی ہے اور تاریخ کے زیادہ تر ادوار میں اسی کا سورج چمکتا ہے۔

ھوچی منہ ایک مایوس دوست کو نصیحت کرتے ھوئے کھتے ھیں،،،،،،

عزیزمن! تم نے سب پڑھا لکھا فراموش کر دیا ہے۔ تم نے اپنی انقلابی منشور میں یہ بات نہیں پڑھی کہ عوام کے درمیان پروپیگنڈا کرنا چاہیئے اور انہیں علم و دانش سے بہرہ ور کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ اب تم خود ہی بتاؤ اگر تمام مخلوق پڑھی لکھی، صاف ستھری اور ایک دوسرے کے لیے محبت کے جزبات رکھنے والی ہوتی تو پھر اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ ہم عوام کے پاس جا کر انہیں سمجھائیں، پھر تو تمام لوگ خود بخود اپنے بُرے بھلے کی تمیز کر کے اپنے جزبوں کی تسکین کا ذریعہ ڈھونڈ لیتے۔۔۔۔

☆☆☆《《ھوچی منہ》》☆☆☆

ماما قدیر ہم منافق ہیں

Ali Khurram

یہ کون لوگ ہیں جو 700 کلومیٹر کا سفر طے کر کے 27 دن میں پیدل کوئٹہ سے کراچی پہنچے ہیں؟ یہ کیوں اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے شہر سے کوسوں دور کراچی پریس کلب پر جوان چہروں کی تصویریں لئے بیٹھے ہیں؟ آنا ہی تھا تو اکیلے آجاتے اپنے خاندان کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو ساتھ کیوں لے آئے؟ باوجود اس کے کہ ہم ہر محفل میں سیاست پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں اور بڑے شوق سے ٹاک شوز پر مرتب تبصرے جھاڑ رہے ہوتے ہیں ان خاندانوں کے حوالے سے کوئی سوال ہمارے ذہن میں نہیں آیا۔ بلوچستان سے نکلنے والی گیس غائب ہو جائے تو ہم سڑکوں پر آجاتے ہیں مگر وہاں کے لوگ غائب ہو جائیں تو ہمارے سر پہ جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ رویہ کس چیز کی نشاندہی کر رہا ہے اگر یہ بھی سمجھانے کی ضرورت پڑ جائے تو مجھے کہنا پڑے گا کہ ہم سے زیادہ بے حس شاید کوئی نہ ہو۔

بلوچستان سے نکلنے والی گیس غائب ہو جائے تو ہم سڑکوں پر آجاتے ہیں مگر وہاں کے لوگ غائب ہو جائیں تو ہمارے سر پہ جوں تک نہیں رینگتی یہ بات اب صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو بلوچ عوام سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی نگاہ میں تو صرف وہاں موجود وسائل ہیں جن کو حاصل کرنے کے لئے یہ ریاست کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔

یہ بات اب صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کو بلوچ عوام سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی نگاہ میں تو صرف وہاں موجود وسائل ہیں جن کو حاصل کرنے کے لئے یہ ریاست کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ عمران خان ڈرون اور الطاف حسین طالبان کے پیچھے تو پڑے ہیں مگر ان سمیت کسی بورژوا سیاسی پارٹی میں اتنی سیاسی اور اخلاقی جراءت نہیں کہ پاکستانی ریاست کے بہیمانہ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ ہمیں بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ امریکہ نے عافیہ صدیقی کے ساتھ اور طالبان نے ملالہ کے ساتھ کیا سلوک کیا مگر کون ہے جو پوچھ سکے کہ ڈاکٹر شازیہ کو جبر و وحشت کا نشانہ بنانے والے فوجی افسران کے خلاف کیا کاروائی کی گئی۔ ہاں اس کے لئے آواز اٹھانے والے نواب اکبر بگٹی کو باغی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیونکہ اس مغرور فوج کے خلاف آواز اٹھائے موت کی جو آرزو کرے ورنہ مجال ہے کہ یہاں گفتگو کرے

(جوش ملیحا بادی)

یہ واقعہ اُس رویہ کی عکاسی کرتا ہے جو پاکستانی ریاست نے بلوچوں کی جانب سالوں سے اختیار کر رکھا ہے۔ ایسا رویہ صرف ایک نیوکالونیلسٹ اپنی کالونی کی طرف رکھتا ہے۔ اس وقت جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں ماما قدیر اور بانوک فرزانہ مجید اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کراچی پریس کلب پر اپنے پیاروں کی تصاویر لئے بیٹھے ہیں اور پشین سے ۳ نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ کیا اس سے زیادہ ڈھٹائی سے کوئی ظلم کر سکتا ہے؟ کیا اس سے زیادہ سفاک کوئی ہو سکتا ہے؟ اور پھر ان لاشوں پہ لکھا پاکستان زندہ باد کیا خود چیخ چیخ کر بلوچوں سے فریاد نہیں کر رہا کہ پاکستان تمہارا دشمن ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ریاست کے مظالم کی صحیح داستاں رقم کرنا میرے بس کی بات نہیں کیونکہ

تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرطِ شرم سے منہ ڈھانپنے لگے

(جوش ملیحا بادی)

پاکستانی ریاست سے تو کسی قسم کی امید نہیں۔ اس نے تو طے کر لیا ہے کہ جو کچھ اس نے بنگلادیش میں کیا تھا وہی کچھ بلوچستان میں جاری رکھے گی مگر پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے دل بھی اس ظلم و بربریت پر کیوں نہیں پسیج رہے؟ کیا ہم لوگوں نے بھی پھر اس ہی طرح اپنے اوپر قابض حکمرانوں خاص کر فوجی اداروں کی حمایت جاری رکھنی ہے جس طرح بنگالیوں کی نسل کشی کے وقت کی تھی۔ میں خاص کر پنجاب اور سندھ کی شہری آبادی سے التجا کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے جو پروپیگنڈا رکھا جا رہا ہے اسے خاموشی سے تسلیم نہ کریں۔ بلوچستان کی تحریک کی

رہنمائی کوئی سردار نہیں بلکہ مشکے کے ایک مٹی کے گھر میں پیدا ہونے والا ڈاکٹر اللہ نذر کر رہا ہے اور بلوچستان کے زیادہ تر سردار تو بلوچ قوم کو دھوکہ دے کر پاکستانی ریاست کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اول تو پہاڑوں پر چڑھے لوگ دہشت گرد نہیں بلکہ اپنے وسائل پر اپنی زمین پر اپنا حق چاہتے ہیں ورنہ وہ بھی طالبان کی طرح عام عوام کو نشانہ بنا رہے ہوتے۔ اس کے علاوہ بلوچ قوم پرست عام پنجابی یا کسی بھی اور قومیت کو نشانہ نہیں بنا رہے اور یہ تاثر دینا سراسر ناانصافی ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ جن لوگوں کو اٹھایا گیا وہ کوئی پہاڑوں پر نہیں چڑھے ہوئے تھے بلکہ صرف زبان کے ذریعے لوگوں تک پاکستانی ریاست کے کرتوتوں کی داستاں سنا رہے تھے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح آپ لوگوں کو روک لیں گے؟ اس وقت حالت یہ ہے کہ عام بلوچ پریس کلب کے نام سے بھی ڈر جاتا ہے کہ کہیں کسی ایجنسی نے دیکھ لیا تو اٹھا کر لے جائے گی مگر ان کے دلوں کے اندر پہاڑوں والے ہی بستے ہیں پاکستان نہیں۔

لیکن ایک ایسا معاشرہ جہاں دانشور بھی اپنے مفادات میں الجھے ہوں وہاں حق کی بات کون کرے؟ ایک طرف حامد میر بڑی چالاکی سے بلوچوں کے دل جیتنے اور سردار مینگل اور ریاست کے ساتھ سمجھوتے کے لئے تیار دیگر سرداروں کے لئے راہیں ہموار کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں تو دوسری طرف عاصم سجاد جیسے لوگ جو ان چند دانشوروں میں سے ہیں جن سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں نہ جانے کس وجہ سے ڈاکٹر مالک کا قد بڑھا رہے ہیں جو مکمل طور پر ریاست کے تابع ہیں۔ ترقی پسند ہم جیسے طالب علموں کو یہ سمجھانے میں لگے رہتے ہیں کہ قوم پرستی کی سیاست کے بجائے طبقات کی سیاست کرنی چاہئے۔ جبکہ بلوچوں کے قومی حق کو تسلیم کرنا کسی حساب سے طبقاتی سیاست سے دور ہونا نہیں اس کے برعکس جو رویہ ترقی پسندوں نے اپنا رکھا ہے وہ خود حب الوطنی کے جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ مزید کنفیوژن بریزنسکی کا حوالہ دے دے کر یوں پھیلائی جاتی ہے کہ سامراج اس خطے کو توڑنا چاہتا ہے جیسے پاکستانی ریاست تو جیسے سامراج سے حالتِ جنگ میں ہے۔ ان تمام رویوں کے ساتھ لاپتہ افراد کے حوالے سے بات کر کے اور ''ماما قدیر ہم شرمندہ ہیں'' کہہ کر ہم لوگ اپنی منافقت پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔ ہمارا مسئلہ یہی ہے کہ ہم بنیادی مسئلہ پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور نتائج پر بات کر کے ترقی پسند بن جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ ریاست باپ ہے اور باشندے اولاد تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ میرا باپ چور ہے۔

بلوچوں کے ساتھ بڑی ناانصافی یہ ہے کہ ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی پاکستانی ریاست نے بلوچستان کو اپنی سرحد میں شامل کر رکھا ہے۔ مزید ظلم یہ کہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے پر ان کو غائب بھی کر دیا جاتا ہے۔ ماما قدیر ہم شرمندہ صرف اس لئے نہیں کہ آپ کے بچے لاپتہ ہیں بلکہ اس لئے بھی کیونکہ جنہوں نے آپ کے بچے آپ سے چھین لئے ہیں انہوں نے سالوں سے آپ کی زمین بھی آپ سے چھین رکھی ہے اور جب تک وہ زمین آپ کو واپس نہیں ملے گی آپ کے بچے آپ سے یونہی چھینے جاتے رہیں گے۔ یہ دانشور سچ نہ بول سکیں گے مگر

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

انقلابی پارٹی کو اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ پارٹی نے حملہ کرنے کا فن تو بخوبی سیکھ لیا ہے.....لیکن اب اسے یہ علم بھی حاصل کرنا چاہیے پسپائی کہ صورت میں کم از کم نقصان اٹھاتے ہوئے مراجعت کیسے کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ دشمن پر فتح پانا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس پر حملہ کرنے اور ضرورت کے وقت مراجعت کرنے کے صحیح فن سے ہم پوری واقفیت حاصل نہیں کر لیتے۔۔

☆☆☆لینن☆☆☆

حملہ کرنے کا اصول ۔ ہمت سے آگے بڑھو!

برائن ٹریسی

عمل ہی سب کچھ ہے۔ وہ شخص جو اپنے آپ سے مخلص ہے وہ اپنے ہدف کی جانب مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے آپ سے مخلص نہیں ہوتے وہ اپنے ہدف کی جانب بڑھنے میں بہت دیر کردیتے ہیں۔ ایسے لوگ سوچتے ہیں کہ شاید ان کیلئے سب کچھ خود بدل جائے گا لیکن ایسے لوگ غلط سوچتے ہیں۔ جب تک اپنے عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی جائے تب تک مواقع نہیں پیدا ہوتے۔ جیسا کہ نپولین نے کہا تھا۔ ”مواقع؟ میں خود مواقع پیدا کرتا ہوں۔“

شمالی افریقہ کی جنگ۔

1941ء میں شمالی افریقہ میں برطانیہ نے اٹلی کی فوج کو بری طرح لتاڑا۔

اٹلی کے بادشاہ مسولینی نے جرمنی کے ہٹلر سے مدد مانگی۔

ہٹلر نے جنرل اروِن رومیل، جو کہ بعد میں فیلڈ مارشل بنا، کو بھیجا تا کہ وہ برطانوی فوجوں کی خبر لے اور ان سے وہ علاقہ واپس لے جو اس نے اٹلی سے چھین لیا تھا۔ برطانیہ کو بھی اپنی جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوگیا تھا کہ جنرل رومیل بہت بڑی فوج کے ساتھ افریقہ آرہا ہے۔ برطانوی افسران نے فرض کرلیا تھا کہ جب جنرل رومیل یہاں پہنچے گا تو اسے جنگ کی تیاری میں کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو جنگ کیلئے تیار کرلیں گے۔

> ”جب ایک مرتبہ علان جنگ کردیا جائے تو پھر پوری شدت سے حملہ کردینا چاہیے، دشمن کو بھاگنے نہ دیا جائے بلکہ اس کا خاتمہ کردیا جائے۔“
>
> ”الفریڈ ماہان“

> **”عمل ہی بس کچھ ہے۔ وہ شخص جو اپنے آپ سے مخلص ہے وہ اپنے ہدف کی جانب مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے آپ سے مخلص نہیں ہوتے وہ اپنے ہدف کی جانب بڑھنے میں بہت دیر کردیتے ہیں۔ ایسے لوگ سوچتے ہیں کہ شاید ان کیلئے سب کچھ خود بدل جائے گا لیکن ایسے لوگ غلط سوچتے ہیں۔ جب تک اپنے عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی جائے تب تک مواقع نہیں پیدا ہوتے۔ جیسا کہ نپولین نے کہا تھا۔ ”مواقع میں خود مواقع پیدا کرتا ہوں۔“**

جبکہ جنرل رومیل نے جیسے ہی فوج، ٹینک، گاڑیاں اور اسلحہ وغیرہ بحری جہاز سے اتارا تو اس نے فوراً برطانوی فوج پر حملہ کردیا اس طرح برطانوی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر شدید حملہ کردیا اور برطانوی فوج کو بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ جنرل رومیل ایک تجربہ کار اور ایک منجھا ہوا جنرل تھا، اس نے برطانیہ کی فوج کو سکندریہ سے ساٹھ میل دور صحرا میں دھکیل دیا۔ جنرل رومیل تو پورے مصر پر قبضہ کرلینا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس ایندھن اور اسلحہ کی کمی تھی۔

جنرل رومیل کا ایسا سخت حملہ برطانیہ کی فوج کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ جنرل رومیل کو بیسویں صدی کا عظیم ترین جنرل قرار دیا گیا۔ جو فوج حرکت میں ہوتی ہے اس میں حملہ کرنے کی جرات اور شدت زیادہ ہوتی ہے۔

حملہ کرنے کی حکمت عملی۔

نپولین کی فوج ہر جنگ کے بعد فتح یاب ہوتی تھی اس نے تقریباً تمام یورپ کو

فتح کرلیا تھا کیونکہ اس نے مسلسل حملہ کرنے کی حکمت عملی کو اپنایا ہوا تھا۔فوج کو منظّم کرو، حملہ کردو اور پھر حملہ پر حملہ کرتے رہو۔

جب دو فوجوں کا مقابلہ ہوتا تھا تو نپولین پہلے حملہ کر کے اس کے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا، اس کے بعد دوسرا حملہ کرتا تھا اور مدمقابل فوج کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا تھا۔اٹھارویں صدی میں فریڈرک دی گریٹ نے تمام پروشیا کو ایک بادشاہ کے ماتحت متحد کر دیا تھا، اس طرح پروشیا کا رقبہ بھی دگنا ہو گیا تھا۔فریڈرک کا کہنا تھا کہ حملہ پر حملہ کرو، دشمن پسپا ہو جائے گا اور فتح تمہاری ہوگی۔

''جنگیں دفاع سے نہیں جیتی جاسکتیں۔''نپولین

حملہ آور ہونے کا اصول

عظیم کمانڈر وہ ہوتا ہے جو شاندار رہنمائی کر سکے، جس کا حوصلہ بہت بلند ہو۔آگے بڑھنے کیلئے ہمیشہ حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں خطرات کا سامنا کرنا پڑھتا ہے لیکن اس کے باوجود کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی۔

وہ تمام قسم کے عظیم کامیابیاں جو کہ حملہ آور ہونے کے نتیجے میں عمل میں آتی ہیں ان حملوں میں ضرور کوئی خاص اور مختلف بات ہوتی ہے، کیونکہ حملہ کس مدمقابل پر ہی کیا جارہا ہے جب حملہ آور کو فتح ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مدمقابل کی نسبت حملہ آور نے زیادہ بہتر ایکشن کیا جس کی وجہ سے اسے فتح ملی۔

حوصلہ اور عزم ایک ایسی خوبی ہے جو انسان کو ہر اس جگہ عمل کرنے پر اکساتی ہے جہاں اسے عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب کوئی کمانڈر حملہ کرنے کا ایکشن لیتا ہے تو وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

حملہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فوج کے دفاع کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ حملہ کرنے کی جرات ہی دفاع کو مضبوط کرتی ہے۔جس فوج میں حوصلے کی کمی ہو، ایسی فوج نہ تو حملہ کر سکتی ہے اور نہ ہی دفاع کر سکتی ہے۔اس کا مقدر دشمن سے شکست کھانا ہی ہوتا ہے۔

اس لیے حملہ کرنے کا یہ اصول ہے کہ کمانڈر پہلا قدم حوصلے اور عزم سے اٹھائے دشمن کی کمزوریوں کو تلاش کرے اور شدت سے حملہ کر کے غیر متوقع نتائج حاصل کرے۔

مہم پسندی کے رجحانات اور خیالات پر بحث کرتے ہوئے لینن کہتے ہیں کہ۔،،سیاست میں یہ رجحانات چھوٹے درمیانہ طبقہ کے نظریات اور ان کی سطحی انقلابی سوچ کی پیداوار ہیں۔۔۔

9۔مسلح بغاوت سیاسی جدوجہد کہ ایک خاص شکل ہے اور مخصوص قوانین وقواعد کے تابع ہے۔ہمیں جن پر پوری پوری توجہ دینی چاہیے۔۔

☆☆☆《لینن》☆☆☆

پریس کانفرنس

بی ایچ آر او

معزز صحافی حضرات۔

آپ لوگوں کو بخوبی علم ہے کہ گزشتہ چار سالوں سے وائس آف بلوچ مسنگ پرسنز اور لاپتہ افراد کے لواحقین جبری گمشدگیوں کے خلاف مسلسل احتجاج کرتے آرہے ہیں۔انہوں نے احتجاجی مظاہروں، احتجاجی ریلیوں اور 1321 دن تک کوئٹہ، اسلام آباد اور کراچی کے پریس کلبوں کے سامنے بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کر انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں اور جبری گمشدگیوں کے خلاف آواز بلند کی، ریاستی اداروں، ریاستی عدالتوں اور کمیشنوں کے سامنے جبری گمشدگیوں کے حوالے پورٹیں پیش کرتے رہے ہیں اور اپنی آواز کو موثر انداز میں دنیا تک پہنچانے کیلئے انہوں نے کوئٹہ تا کراچی لانگ مارچ کر کے جبری گمشدہ افراد کی بازیابی کیلئے ایک مثالی جدوجہد کی لیکن اس پرامن اور جمہوری جدوجہد کو میڈیا اور حکمرانوں نے مکمل نظر انداز کر دیا۔لانگ مارچ کے دوران کی تمام تکالیف اور مصیبتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے لانگ مارچ کے شرکاء نے لانگ مارچ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا لیکن کسی حد تک لانگ مارچ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا کیونکہ لانگ مارچ کے دوران ریاستی ادارے اپنی روش کو برقرار رکھتے ہوئے بلوچستان بھر میں چھاپوں، اغواء اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے میں مصروف تھے، پنجگور، ڈیرہ بگٹی، آواران، مشکے، گریشہ سمیت مختلف علاقوں میں فورسز نے بلا جواز چھاپے مارے اور لوگوں کو جبری اغواء کیا اور آج بھی ریاستی فورسز کی جانب سے بلوچستان میں لوگوں کو جبری طور پر اغوا کرنے اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے کا عمل بدستور جاری ہے۔کل (25 نومبر) بھی پنجگور کے رہائشی مسلم ولد امام الدین کی مسخ شدہ نعش واشک سوراب سے برامد ہوئی ہے۔15 سالہ مسلم پنجگور سے 7 ماہ قبل جبری گمشدگی کا شکار ہوا تھا۔بلوچستان میں ماورائے عدالت وقانون چھاپوں، اغوا نما گرفتاریوں اور سیاسی کارکنوں کی ٹارگٹ کلنگ تا ہنوز جاری ہے۔گزشتہ دنوں ماورائے عدالت وقانون چھاپوں کے دوران سیکورٹی فورسز نے پنجگور کے علاقے گرمکان سے تنویر ولد ارشاد، سہیل ولد بہار، اختر بلوچ، قندل شاہ ولد محمد جان اور یاسر خان بلوچ کو اغوا کرتے ہوئے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیے۔اسکے علاوہ 15 نومبر 2013 کو ماروا ڈ میں ماورائے قانون وعدالت چھاپے مار کر چادر و چار دیواری کی تقدس کو پامال کرتے ہوئے گھروں میں موجود عورتوں اور بزرگوں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا، کئی گھروں کو بھی آگ لگا دی گئی اور علاقہ مکینوں کے مطابق 40 افراد کو ماورائے قانون وعدالت جبری طور پر اغوا کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا۔اسی طرح نال ہسپتال کے ملازم رفیق عبدالکریم کو 31 اکتوبر کی رات کو 2 ویگو گاڑیوں میں سوار خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے اغوا کر کے لاپتہ کر دیا۔بلوچستان میں فورسز کی دہشت گردی اور انسانی حقوق کی پامالیوں کی صرف چند مثالیں ہیں۔

معزز صحافی حضرات!

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے زیر اہتمام ماما قدیر اور ہمارے ساتھیوں نے ایک عزم کے ساتھ انسانی حقوق کی پامالیوں اور اپنے پیاروں کی عدم بازیابی کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔بلوچستان میں ریاستی دہشتگردی، جبری اغواء اور مسخ شدہ لاشوں میں ملوث ریاستی ادارے آج میڈیا کی خاموشی اور زمہ دار اداروں کی بے حسی کو اپنا سہارہ بنائے ہوئے ہیں۔اور انہیں نہ کسی احتجاج کی پروہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی آواز پر کان دھرتے نظر آتے ہیں۔بلوچستان میں انسانی حقوق اور عالمی قوانین کی پامالی روز مرہ کا معمول بن چکے ہیں۔آئے روز ماورائے قانون چھاپے گرفتاریاں، جبری اغواء اور مسخ شدہ لاشیں جیسے واقعات بلوچستان کی صورتحال کی سنگینی کے واضح علامتیں ہیں۔اس تشویش ناک صورتحال میں اگر چہ کسی بھی عالمی میڈیا، ملکی میڈیا، اقوام متحدہ سمیت دیگر عالمی اداروں نے اب تک جو کردار ادا کیا ہے وہ قابل افسوس حد تک ناکافی ہے۔کسی بھی انسان کو جسے انصاف، سچائی، عالمی قوانین اور انسانی حقوق کے عالمی چارٹر پر اعتماد ہے اس کیلئے عالمی اداروں اور میڈیا کا یہ کردار انتہائی مایوس کن ہے۔

بلوچستان میں انسانی حقوق کی سنگین پامالیاں شدت اختیار کرتی ہوئی جبری گمشدگیوں اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے میں ریاستی ادارے براہ راست ملوث ہیں جس کا اقرار ریاستی میڈیا، عدلیہ سمیت پاکستانی و عالمی انسانی حقوق کے ادارے متعدد بار کر چکے ہیں۔اس کے باوجود وبھی تاحال کوئی قابل زکر اقدام سامنے نہیں آیا ہے۔بلوچ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن عالمی میڈیا سے برائے راست مطالبہ کرتی ہے کہ وہ بلوچستان کی سنگین صورتحال اور بلوچ عوام کی احتجاج کا نوٹس لے اور بلوچستان میں ریاستی دہشتگردی کے واقعات کو سامنے لا کر اپنی صحافتی ذمہ داری پورا کریں۔

ہم عالمی اداروں، اقوام متحدہ انسانی حقوق کے اداروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بلوچستان کے معاملے پر سنجیدہ اقدامات اٹھاتے ہوئے بلوچستان میں جاری، انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، عالمی قوانین کی پامالی کے خلاف اپنا مینڈیٹ استعمال کریں۔

بلوچستان میں زلزلہ اور ریاستی بربریت

پمفلٹ

قدرتی آفت اوران کے نتیجے میں جنم لینے والی اندوہناک صورتحال اگر چہ نظام قدرت کے لازمی جزو ہیں،مگر آزاد وخودمختار معاشرے میں اس سے نمٹنے کے جوفلاحی اور معاشی انتظامات کئے جاتے ہیں، وہ بدقسمتی سے غلامانہ سماج میں ناپید ہوتے ہیں۔ریسکیو، ہنگامی صورتحال کا نفاذ، فرسٹ ایڈ تک رسائی، ریلیف آپریشن، شیلٹر خوراک کی فوری سہولت، معاشی امداد اور بحالی زندگی کے دیگر انتظامات ان کے ہاں مفقود ہوتے ہیں۔گویا بھوک، پیاس، بے سہارگی، لاچاری، مفلسی اور وبائی امراض کا شکار ہونا ان کی روٹھی ہوئی زندگی کے پہچان بن جاتے ہیں۔

قدرتی آفت کے ایک ایسی ہی صورتحال سے گزشتہ مہینے آواران، مشکے، تیرتیج، بزداد، مالار، گیشکور اور ڈنڈار متاثر ہوئے، جہاں شدید نوعیت کے زلزلہ نے تباہی مچادی۔غلامی کے عطاء کردہ مٹی گھارے سے بنے کئی ہزار گھر منہدم، سینکڑوں جانیں ضائع اور لاکھوں لوگ بے سہارا ہوگئے۔کچے مکانات کے ملبے تلے ہر طرف لاشیں دبی ہوئی پائی گئیں، جنہیں اپنی مدد آپ نکالنے میں ایک آدھ ہفتے کا پیریڈ درکار تھا۔حالانکہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مشہور سینڈی طوفان آتا ہے، بہتر انتظامات کے سبب وہاں فقط 10 لوگ جاں بحق ہوجاتے ہیں۔دوسری طرف شدید گرمی میں کھلے آسمان تلے بیٹھنے کے علاوہ تعفن پھیلنے کے سبب زلزلہ متاثرین علاقوں میں وبائی امراض پھوٹ پڑنے کے امکانات ناقابلِ تردید بنتے جارہے تھے۔مگران دگرگوں حالات میں حسبِ سابق مادرِ وطن اس بار بھی اپنی دُکھ درد بانٹنے میں تنہا تھی۔سدآفرین بلوچ عوام کو جنہوں نے ناگفتہ بہ اور قہر بھری حالات میں یکسوئی کا مظاہرہ کرکے ایک دوسرے کی نہ صرف دکھ درد میں برابر کے شریک رہے بلکہ افرادی ومعاشی کمک کے تحت اپنے ہم وطنوں کا واحد سہارا بن کر زندہ ضمیر اور خوددار قوم ہونے کا ثبوت دیا۔مگر پاکستان اس کی فوج اور دشمن حلقوں نے اس سہل موقع کو غنیمت جان کر آفت زدہ علاقوں میں راتوں رات گھسنے کا دم بھرلیا۔تاکہ ممکنہ طور پر کسی بھی غیر جانبدار ادارے کی مداخلت اور حقائق تک رسائی سے قبل علاقائی نفسیات اور حقیقی سیاسی قوتوں کی عمل دخل اور کردار کو منتشر کرنے کا بروقت بندوبست کیا جاسکے۔اسی لئے متاثرہ علاقوں میں پہنچتے ہی قابض آرمی نے پہلے پہل قومی بیرک، وال چاکنگ اور دیگر قابل ذکر سیاسی نشانیوں وسیاسی عوامل کو عام انسانی نظروں سے اوجھل رکھنے کا ٹھان لیا۔متاثرین کے لئے قومی تنظیموں کی جانب قائم کردہ ریلیف اور میڈیکل کیمپوں کو اُکھاڑ پھینک دیا گیا۔زلزلہ متاثرین عوام پر فوجی کاروائیاں اور شیلنگ کے علاوہ سماجی امدادی سرگرمیوں پر قدغن لگا کر جبر کے سائے میں خوف کا عالم طاری کرکے سیاسی دوستوں کو گراؤنڈ سے منتشر ہونے پر مجبور کردیا۔جبکہ بلوچ رضا کار ساتھیوں کو مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کا نشانہ بنایا گیا۔علاوہ ازیں بلوچ قومی امداد کو آڑے ہاتھوں لے کر بنیادی ضروریات زندگی اور اشیائے خورد ونوش کے سینکڑوں ٹرکوں کو اپنے تحویل میں لے کر فوجی کیمپوں میں لاکھڑا کیا گیا۔اُدھر ریاستی گماشتہ وزیراعلی کی جانب سے بے بنیاد دعوؤں کا ایک نہ کنے والا سلسلہ چل نکلا۔اقوام متحدہ، آکسفیم اور دیگر عالمی فلاحی اداروں کو یہاں آکر کام کرنے کی اجازت دینے کے بجائے این جی اوز کے نام پر پاکستان آرمی نے اپنی بغل بچہ دہشتگرد تنظیمیں جماعت الدعوۃ حافظ سعید کے فلاح انسانیت فاؤنڈیشن، جیش محمد مسعود اظہر کے الرحمت ٹرسٹ، جماعت اسلامی منورحسن کے الخدمت فاؤنڈیشن، الخیر فاؤنڈیشن اور انسانی کاروبار میں نام کمانے والے بدنام زمانہ ایدھی ٹرسٹ کو متاثرہ علاقوں میں لوگوں کے قریب جاکر ان کی علاقائی، قبائلی، مذہبی وسیاسی مزاج، نفسیات اور خیالات وتاثرات کا بغور جائزہ لینے اور انہیں مذہبی جنونیت وپاکستانیت کی جانب مائل کرانے کا ٹاسک دے کر متحرک کیا گیا۔

حالانکہ DOCTORS WITH OUT BORDERS, WFO, UNICEF سمیت دیگر کئی عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں وفلاحی اداروں کی واضح پیشکش کے باوجود انہیں کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔جس سے بلوچ عوام کے خلاف پاکستانی عزائم کا کھل کر اظہار ہوتا ہے۔دوسری جانب غلیظ سیاست چمکاتے قابض ریاستی نمائندہ ڈاکٹر مالک، آئی ایس آئی آلہ کار خاص حاصل بزنجو، برسوں سے سیاسی گراؤنڈ سے بیدخل قدوس بزنجو اور سیاسی فقیر خیر جان بزنجو سمیت دیگر کئی گماشتہ عناصر نے آواران ٹاؤن میں ڈھیرے ڈال دیئے، لیکن انہیں طویل مدت قیام کے دوران آواران جیسے سیاسی شعور سے لبریز علاقے میں کہیں بھی منفی سیاست کے پرچار کی جگہ نہ ملی۔

جبکہ پاکستانی وزیراعظم، پنجابی وزیراعلیٰ اور آرمی سربراہ کی آواران آمد اور ماڈل سٹی، پیرس نظیر شہر کی تعمیر، ترقی وخوشحالی کے منصوبے، ڈویلپمنٹ، روڈ بجلی معاوضے وغیرہ کے اعلانات اسی نو آبادیاتی استحصالی زہنیت کا مظہر، دھوکہ دہی اور فراڈ پر مبنی غلیظ سیاست اور رد انقلابی نفسیاتی ہتھکنڈوں کی کڑیاں ہونے کے ساتھ ساتھ دولتِ مشترکہ، یورپی یونین اور تھائی لینڈ چین امریکہ وسعودی عرب سے رقم بٹورنے کے پُرانے حربے ثابت ہوئے، جنہیں بلوچ عوام نے ہر صورت مسترد کردیا ہے۔

دھرتی ماں کے وارثو!

قوموں پر آزمائشی وجان لیوا مراحل مختلف صورتوں میں ان کی زندگی میں ہر حال میں آتے رہتے ہیں۔جس طرح مظلوم بنگالیوں کی جدوجہد کے دوران انہیں سیلاب جیسی طوفان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اوراس میں ہزاروں بنگالی لقمہء اجل بن گئے تھے۔مگر زندہ اقوام اپنے قومی جوش وجذبے، بلند وبالا حوصلے اور آہنی عزائم کا مالک ہوکر صبر واستقامت سے ہر قسم کی مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، اور سنگین حالات سے خود ہی نپٹنے کی صلاحیت کا حامل ہوتے ہیں، جس طرح بلوچ قوم نے ثابت کردکھادیا ہے۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد

آئینہ حقائق

چیدہ چیدہ حالات ، واقعات اور خبروں پر آزاد کا ماہانہ تجزیہ

ادارہ

بلوچستان کیے مختلف علاقوں فوجی کا روائی میں تیزی

آزادی، حقوق اور سرزمین کی دفاع کے لئے بلند کئے جانے والے قومی صداؤں کی پاداش میں جبر واستبدادیت کا ایک ایسا تسلسل اور اس میں بتدرریج شدت کہ یزیدیت بھی نشرما جائے۔ سرکشی و یسنہ زوری کی ایسی گھمنڈ کہ ریاست پاکستان عالمی انسانی حقوق کی مراوجہ اُصولوں وقوانین کا تمسخر اُڑا کر انہیں طاقت وغرور کے شعلوں کی نظر کرنے میں زرا برابر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ گویا سرکش ریاست پاکستان ہر قسم کی بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری سے مشتثنی قرار پایا ہے۔ پنجگور پروم، خاران وبیسیمہ کے ساتھ ساتھ نومبر کے اوائل میں ڈیرہ بگٹی ونصیر آباد کے مختلف علاقے فوجی کارروائیوں کے شدید نشانے پر رہے۔ بلوچ آبادیوں پر بمبار منٹ شیلنگ اور زمینی حملوں کے نتیجے میں خواتین وبچوں سمیت ایک درجن سے زائد بلوچ فرزندوں کی شہادت، پچاس سے زائد افراد کا لہولہاں ہونا، گھروں و کھڑی فیصلوں کو جلا کر راکھ کر دینا، کیہی درجن افراد کی اغواء نما گرفتاری اور سیاسی کارکنوں کے گھروں پر چھپاے، اہلخانہ و رشتہ داروں کو اُٹھا کر غائب کرنا اول الذکر سطور کی تمہید ہے۔

علاوہ ازیں مشکے، آواران اور کولواہ کے علاقوں میں زلزلہ ذدگان بلوچ عوام پر فوجی کارروائیاں اور متاثرین کو حراساں کرنے میں تشویشناک حدتک اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم وصحت کے اداروں پر پاکستان آرمی کا قبضہ بدستور جاری ہے، جہاں علاقہ مکینوں کے گرد گھیرا تنگ ڈالا گیا ہے۔ دوسری جانب قلات سُوراب نال گریشہ خضدار میں آئی ایس آئی کے زیر سرپرستی سرگرم عمل بلوچ کُش مافیا کے کارندوں نے علاقے کے عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا ہے۔ خضدار میں کمانڈر منیر بلوچ اور مقامی آزادی پسند رہنما کے دو کمسن اور معصوم رشتہ داروں کے بے دردی سے اندھی گولیوں کا نشانہ بنانا، خضدار ہی میں بی ایس او آزاد کے شہید کارکن ہارون زہری کے بزرگ والد حاجی عبدالروٗف زہری کو شہید کرنا، بی این ایم پنجگور کے رہنما اور بلوچی زبان کے نامور شاعر قاسم وفا کو بھی ہدف بنا کر شہید کرنے سمیت اغواء نما گرفتاریوں اور مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی کا سلسلہ بھی بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔ جبکہ نال وگریشہ میں بھی بلوچ کش مافیا کے دہشگردوں کی بدمعاشیاں عُروج پر ہیں۔ گزشتہ مہینے بھاری تعداد پر مشتمل نفری نے مقامی آبادیوں پر دھاوا بول کے لوگوں کو بلاوجہ زدکوپ کیا، اور ڈرا دھما کا کر زبردستی گھروں میں گھُس کر چادر وچار دیواری کے تقدس کی پامالی کر کے قیمتی اشیاء اور نقدی لوٹ لئے، پھر سب کو باقاعدگی سے بھتہ ادا کرنے کا پابند بنایا۔ ان حالات میں جہاں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں ڈاکٹر مالک وحاصل بزنجو کے اس بیان کا اچانک سامنے آنا کہ ,, مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی کا سلسلہ روکنا ہماری حکومت کی بڑی کامیابی ہے،، پاکستانی عسکری اداروں کی ننگی جارحیت کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ حقیقت میں خفیہ اداروں کے منظور نظر یہ گماشتے بلوچ قوم کو یہ دھمکی نما پیغام دینا چاہتے تھے کہ جاری نسل کُشی اور مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی کا عمل ابھی مدہم سے شکل میں سرانجام پا رہا ہے، آگے چل کر یہ مزید خطرناک رُوپ دھار لے گا۔ اور پھر حسبِ توقع سات مہینے سے لاپتہ پنجگور کے رہائشی اور نویں جماعت کے طالب علم بی ایس او آزاد کارکن مسلم امام کی مسخ شدہ لاش پھنک دی گئی۔ اسی دوران خضدار پنجگور شال اور ڈیرہ بگٹی ونصیر آباد سے متحدہ لاشیں برآمد ہوئیں۔ مند میں گھر پر چھاپہ کے دوران اغواء ہونے والے عزت تنگئی کی تشدد زدہ لاش چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر پھنک دی گئی۔ قومی جہدکاروں کے اہلخانہ اور معصوم رشتہ داروں کی ٹارگیٹ کلنگ اسی شدت پکڑی ننگی جارحیت کا برملا اظہار ہے۔

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی تاریخی لانگ مارچ میں پاکستانی پارٹیاں اور بلوچ گماشتہ پارٹیوں کی کردار

دوسری جانب جبری گمشگان کی عدم بازیابی اور مسخ شدہ لاشوں کی تواتر کے ساتھ برآمدگیوں کے خلاف چار سالوں سے سراپا احتجاج وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کا احتجاجی کیمپ لانگ مارچ کی شکل میں کوئٹہ سے کراچی منتقل کر دیا گیا۔ 27 اکتوبر کو

ماما قدیر بلوچ کی سربراہی میں کوئٹہ سے شروع ہونے والا لانگ مارچ 756 کلومیٹر کا طویل مصافت طے کرنے کے بعد 24 نومبر کو کراچی پریس کلب عوام جم غفیر کے ساتھ پہنچا۔ پاکستانی ٹی وی چینل کا رپورٹ زرائع ابلاغ نے ایک بار پھر اس تاریخی قومی احتجاج کو نظر انداز کر کے اپنا رُخ موڑ لیا۔ سول سوسائٹی، انتظامیہ، فلاحی ادارے کوئی بھی دو قدم ساتھ چل کر دلجوئی کے لئے نہیں رہا۔ گماشتہ پارلیمانی باجگزار گروہوں سے تو گلہ ہی کیا؟ بی این پی مینگل اپنی پُرانی جعلی قوم پرستی کا ماسک چڑھائے مصنوعی ہمدردی کی تحت کہیں نمودار ضرور ہوا مگر بلدیاتی انتخابات کی تیاریوں میں مگن عام انتخابات میں دھتکارنے کی داستانیں ستاتے کہیں کا نہیں رہا۔ گویا احساسِ شرمندگی کی وصف سے عاری ریاستی تلوے چاٹنے کا دامن تھامے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ پارلیمنٹ و جمہوری نظام کا ڈھونگ رچانے بلدیاتی انتخابات کی آڑ میں ایک بار پھر قومی آزادی کی پروان چڑھتی سوچ کو نچلی اور لوکل سطح پر کاؤنٹر کرنے کے لئے گماشتہ عناصر سرگرمِ عمل ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں کو اپنی چرف متوجہ کرنے کے لئے ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ، سینگ کُھسار اور اپنی جعلی سیاسی و سماجی حیثیت کا پرچار کر کے بلوچ عوام کے زہنوں کو آلودہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر مسترد شدہ عام انتخابات کی طرح حالیہ بلدیاتی انتخابات بھی اپنی قانون و اخلاقی جواز کھو چکے ہیں۔ پُر خطر راہوں کا طویل مسافت طے کرنے والے ماما قدیر بلوچ، فرزانہ مجید، سمی بلوچ، بی ایچ آر او کے چیئر پرسن بی بی گل بلوچ، دس سالہ علی حیدر و دیگر نے اپنے پختہ عزم و اِرادوں سے ہمت و برداشت کی قوت سے سرشار ہو کر زخمی پاؤں، جسمانی زہنی تکالیف و حالات کی حسایت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور دھونس دھمکیوں سے مرعُوب ہونے کے بجائے قدم سے قدم ملا کر اپنی آواز اور کردار کو اور مئوثر انداز میں آگے لے جایا۔ اگر چہ دوران مارچ ماما قدیر پر متعدد بار جان لیوا حملے بھی ہوئے، ریاستی ڈیتھ اسکواڈ کے کارندوں کی دھمکی آمیز فون کالز کے علاوہ ان پر براہِ راست بندوق بھی تھان لئے گئے، مگر انہوں نے جنونیت کی حد تک اپنے مقصد کو مقدم سمجھ کر پوری ایمانداری اور کمٹمنٹ سے آگے بڑھنے کا ٹھان لیا۔ نتیجتاً ماما قدیر بلوچ کی مارچ نے نہ صرف بلوچ معاشرہ اور سیاسی جمود کا شکار بعض لوگوں کی ذہنوں اور سوچوں میں ارتعاش پیدا کر کے انہیں خوش فہمیوں سے نکال کر خواب غفلت سے بیدار کیا، بلکہ سوئی ہوئی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ کر ریاستی اداروں میں ہلچل مچادی ہے، کارپوریٹ زرائع ابلاغ کے گونگے لہرے اینکر پرنسز، صحافی ولکھاری طبقہ، سول سوسائٹی اور عدلیہ جیسے اداروں کو بھی لب کشائی پر مجبور کر دیا، اگر چہ پاکستانی اعلیٰ عدلیہ کی اس شوروواویلے کو ایک ڈرامہ تصور کیا جارہا ہے، اور ان حلقوں کا شبہ ہے کہ جس طرح شور برپا کر کے چیف جسٹس نے وفاقی وزیر دفاع کو سپریم کورٹ کراچی رجسٹر میں طلب کر کے سخت ریمارکس دیئے اور ممکنہ طور پر آئی جی ایف سی کی گرفتاری کا حکم جاری کرنے کا عندیہ بھی دیا اور لاپتہ افراد کو ہر صورت پیش کرنے کا اسٹینڈ لیا، اس پر وزیر دفاع کی جانب یقین دہانیاں اور اٹھارنی جنرل کا پہلی بار عدالت میں واضح انکشاف کہ لاپتہ افراد خفیہ اداروں کی حراست میں ہیں، جن میں شاید کچھ زندہ بھی نہ ہوں، اس صورتحال میں ڈرامے کے ڈراپ سین کے طور پر شاید ہی کچھ لوگوں کو بازیاب کرالیا جائے، جن پر ڈاکٹر مالک کی صوبائی حکومت، اختر مینگل اور نواز شریف کریڈٹ لینے کی سی لاحاصل بھی کریں گے، اور اپنی سیاسی امیج کو نکھارنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ پچھلے چند ہفتوں سے پارلیمانی سیاسی گروہوں اور ان کے سربراہاں کی جانب سے اس مسئلے کو خامی ہائی لائٹ کیا جارہا ہے، اور اختر مینگل کی ماما قدیر اور لاپتہ افراد کے لواحقین سے رابطے، کوششیں تیز کرنے اور کردار ادا کرنے کی یقین دہانیاں اس منصوبے کا شاخسانہ ہوسکتا ہے، ساتھ ہی چیف جسٹس افتخار چوہدری 12 دسمبر 2013 میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے وہ جاتے جاتے اپنی شخصیت کو اُبھارنا چاہ رہے ہوں، بہر حال آگے کچھ بھی ہو مگر ماما قدیر نے خاموش تالاب میں پتھر پھینک کر لہریں پیدا کر دی ہیں۔ اب ان لہروں کا کنارے تک پہنچ کر کتنا اثر ہوگا، یہ کہنا قبل از وقت ہے، مگر ماما قدیر اور ان کے ساتھی اپنے مئوقف پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنی جدوجہد کو مزید آگے لیجانے کے لئے پُر عزم ہیں۔ جبکہ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ سپریم کورٹ کی لاپتہ افراد کیس کے حوالے مسلسل سماعتیں اور اس معاملے میں بلوچ قومی حقوق اور قومی سوال کا ایک واضح پہلو عالمی سطح پر اُجاگر ہو کے پاکستان کی بے توقیری کا باعث بنے گا۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستانی لاقانونیت کے بھاڑ ہو کر پاکستان نئی قانون کا اضافہ ہوا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جانب نافذ کردہ بدنام زمانہ ڈی پی آر (ڈیفنس آف پاکستان رُولز) سیاہ قانون کی طرح ,, تحفظ پاکستان آرڈیننس،، اس حکومت کی جانب باقاعدہ قانونی طور پر نافذ کردہ نیا قانون ہے، جس کی رُو سے ,, فوج اور خفیہ اداروں کو کسی بھی شخص کو تین مہینے تک اپنی حراست میں رکھنے کا اختیار حاصل ہوگا،، بلوچ قوم جو پہلے ہی سے قابض ریاست کی سنگینیوں کا شکار ہے، پندرہ ہزار سے زائد بلوچ تا حال آئی ایس آئی کی

عقوبت خانوں میں ہیں، ان میں سے ایک ہزار کے لگ بھگ کی مسخ شدہ لاشیں بر آمد ہوئی ہیں، اب پارلیمان کی جانب اس سیاہ قانون کے زریعے خفیہ ایجنسیوں کو کُھلی چُھوٹ دی گئی ہے کہ وہ باقاعدہ قانون طور پر تسلی سے جب چاہیں، جسے چاہیں بلوچ اور سندھی فرزندوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا سکت ہیں۔ اس کے خلاف جئے سندھ کی جانب سے سندھ بھر میں ہڑتال بھی کی گئی اور بلوچ و سندھی قوم پرست سیاسی حلقوں کی جانب شدید ردعمل سامنے آیا۔

پاکستانی اداروں میں ردوبدلی کے ساتھ بلوچستان کی سیاست پر اثرات

پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کی مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد نومبر کے اواخر میں پاکستانی وزیراعظم نے لیفٹیننٹ جنرل راحیل شریف کو پاکستانی فوج کو نیا آرمی چیف مقرر کردیا اور جنرل راشد کو چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی منتخب کیا۔ دونوں فوجی سربراہان نے 28 نومبر سے اپنے اپنے عہدے کے چارج سنبھال لئے ہیں۔ جبکہ چیف جسٹس افتخار چوہدری کی مدتِ ملازمت ختم ہوجانے پر 12 دسمبر 2013 میں نیا چیف جسٹس تصدیق حسین جیلانی اپنے عہدے کا حلاف اُٹھائیں گے ۔اس خوش فہمی میں مبتلا رہنا محال ہے کہ قابض پاکستانی نئی قیادت بلوچ قوم کے لئے کسی خیر کی نویدے کرآئے گی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی اور تقرری کا یہ عمل اپنے معمول کے مطابق سرانجام پاتا ہے اور بلوچ کے حوالے پالیسیز اُسی جابرانہ سوچ یا ریاستی مائنڈسیٹ کے تحت طے پاتے ہیں، جسے سامراجیت واستحصالیت کا نام دیا گیا ہے، البتہ نواز شریف نے اپنی حکومت کی جان چار ترجیحات کا ذکر کیا ہے اُن میں سرفہرست بلوچستان میں پنپنے والی نیشنلزم پر مبنی سیاسی سوچ، سیاسی ومزاحمتی تنظیموں کے خلاف کریک ڈاؤن اور اُن پر قابو پانے کی حکمت عملی ہے جس کے تحت نئی آرمی چیف کو بلوچ دشمن جنرل (ر) قادر بلوچ کی قربت، دوستانہ تعلقات اور ایماء پر تعینات کیا گیا ہے، لگتا ایسے ہے، مستقبل قریب میں بلوچ قوم کے خلاف فوجی کارروائیوں اور جارحیت میں اضافہ ہوگا جس کے لئے سرے سے حکمت عمل بناتے اور سیاسی لائحہ عمل تشکیل دینے کی ضرورت ہے، اور بالغ نظری کا تقاضا ہی ہے کہ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے اور ٹالنگ اڑائی سے باز آکر اپنی پوری توانائی دشمن نے خلاف صرف کریں بدقسمتی آج ہم اس قدر الزام تراشیوں اور ایک دوسرے کی کردار کُشی پر اُتر آئے ہیں کہ اپنی سیاسی زمہ داریوں، تنظیمی تقاضوں علمی شعوری وتحقیقی سرگرمیوں اور عوام کو بیدار کرانے کے فرائض سے دانستہ یا نادانستہ طور پر پہلوتہی کئے ہوئے ہیں۔ جو سیاست، انقلابی تقاضوں اور تنقید اصولوں سے قطعاً میل نہیں کھاتے۔

ہمیں مزدور طبقہ کے پسماندہ ترین اور غیر ترقی یافتہ حصے تک اپنی بات پہنچانے کی راہ کا علم حاصل کرنا ہے۔ یہ حصہ ہمارے سائنسی فکر سے بالکل متاثر نہیں ہے۔ زندگی بخش سائنسی فکر کو ان تک پہنچانا انہیں اپنے قریب لانا بتدریج اور صبر سے ان کے طبقاتی شعور کی سطح کو بلند کرنا، انہیں سماجی جمہوریت کے انقلابی شعور سے لیس کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا کرتے ہوئے ہمیں اپنے فکر کو کلیہ کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے اور انہیں کتابی تعلیم ہی نہیں دینی چاہیے بلکہ پرولتاریہ کے اس پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ حصہ کو روزمرہ کی عملی جدوجہد میں لاکر ان کے طبقاتی شعور کو بڑھانا چاہیے یعنی ان کی روزمرہ کی روٹی روزگار اور اپنے جسم وجان کے رشتے کو قائم رکھنے کی جدوجہد سے اس شعوری تعلیم کی جدوجہد کو جوڑنا چاہیے۔۔۔

☆☆☆ لینن ☆☆☆

نومبر کے مہینے میں بی ایس او آزاد کے اخباری بیانات

ادارہ

تاریخ:2نومبر 2013

13نومبر یوم شہدائے آزادی منائی جائیگی تمام زون ریفرنسز اور عوامی اجتماعات کا انعقاد کریں۔بی ایس او(آزاد)

13نومبر 1839 کومحراب خان اوران کے سرمچاروں کی مزاحمت کے تسلسل نے تحریک آزادی کی شکل اختیار کرلی ہے۔

کوئٹہ (پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کال کے مطابق13نومبر کو یوم شہدائے آزادی منائی جائیگی تمام زون شہدائے آزادی کی جدوجہداور قربانیوں کوخراج تحسین پیش کرنے کیلئے ریفرنسز اور عوامی اجتماعات کا انعقادکریں بی ایس اوآزادی کی مرکزی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ہرسال13نومبر کو یوم شہدائے آزادی منائی جائیگی اسی مناسبت سے اس سال بھی یوم شہدائے آزادی بھر پور انداز میں منایاجائیگا بلوچستان سمیت دنیا بھرمیں آباد بلوچ یوم شہدائے آزادی کے موقع منعقد پروگراموں میں شرکت کر کے ہزاروں معلوم وگمنام شہداءکی قربانیوں کوخراج تحسین پیش کریں13نومبر کادن بلوچ تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتاہےجس دن بلوچ قوم نے سامراج کے خلاف اپنی آزادی کے بقاء کیلئے قربانیوں کا آغاز کردیا تھا1839 کواسی روز قلات میں خان محراب خان اوران کے سرمچاروں کی قربانی سے شروع ہونے والی مزاحمت اورقربانیوں کےتسلسل نےتحریک آزادی کی شکل اختیار کرلی جس کے بدولت آج بلوچ قوم قابض پاکستان اوراس کے ہمنواء سامراجی قوتوں کی بلوچ قوم کوفتح کرنے اور بلوچ سرزمین کی بالا روک ٹوک استحصال کے منصوبوں کوشکست سے دوچار کرچکی ہےآزادی کےاس کاروان کو ہزاروں معلوم ونامعلوم شہداء نے اپنے خون سے جاری رکھاہے بلوچ سرزمین پرسامراجی استحصال کے ڈیڈھ صدی سے زائد کے عرصہ میں سامراج کی بدلتی ہوئی شکل اور دنیا بھرمیں رجعتی قوتوں کے مضبوط ہونے کے باوجودبھی بلوچ فرزندوں نے اپنے قربانیوں سے انقلاب کےشمع کو روشن رکھ کرعوام کی تبدیلی پرعزم کوختم نہ ہونے دیااورسامراج کے بدلتے ہوئے پالیسیوں اورشاطرانہ چالوں کا مقابلہ کرکےتحریک آزادی کو نئے جہتیں دیں آج ہزاروں بلوچ فرزنداسی سامراج اوراس کے پہلائے ہوئے غلامانہ نفسیات اور رجعتی خیالات کواپنے سماج سے ختم کرنے کے جدوجہد پر کمربستہ ہیں بلوچ قوم یوم شہدائے آزادی بھرپورانداز میں مناکران جہدکاروں کے ساتھ اپنے وابستگی کا اظہارکریں اور ہزاروں معلوم وگمنام شہداکےقربانیوں کو خراج تحسین پیش کریں۔

''

تاریخ:4نومبر 2013

خضدار سوراب میں ڈیتھ اسکواڈ کی درندگی میں شدت آچکی ہے۔ بی ایس او (آزاد)

خضدار میں میرعلی نواز مینگل کوڈیتھ اسکواڈ کارندوں نے فائرنگ کر کے شہید کردیا۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ تحریک آزادی کوکاونٹرکرنے کیلئے قابض فوج کے ڈیتھ اسکواڈز اور مقامی گماشتے بلوچستان بھرمیں قتل وگارتگری کا بازارگرم کیئے ہوئے ہیں خضداراورسوراب میں ایک ہفتے کے دوران 4بلوچ فرزندوں کو پاکستانی فوج اپنے زرخرید ڈیتھ اسکواڈ کے کارندوں کے ساتھ مل کرشہید کرچکا ہے یکم نومبر 2013 کوریاستی ڈیتھ اسکواڈ کےکارندوں نے خضدار غلامانی چوک پر فائرنگ کرکے میرعلی نواز مینگل کوشہیداوران کے ساتھی نثار بلوچ کوزخمی کردیاایک روزقبل سوراب میں 2 کمسن بلوچ فرزندوں نثار بلوچ اوررفیق بلوچ کو فائرنگ کر کے شہید کردیا گیا تھا اسی طرح وڈھ میں پاکستانی فوج نے وقارنصیر بلوچ کومصافر گاڑی سے اتھارکردن دھاڑے شہید کردیا سوراب میں گزشتہ مہینوں سےشہدا کے خاندانوں سمیت عام لوگوں گھروں اور دکانوں کی لوٹ ماراور جلانے کاتسلسل شروع کیا گیا تھااوراب اس درندگی کوشہ دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھرخضداراورگردو نواح میں ڈیتھ اسکواڈ ز بلوچ فرزندوں کے ٹارگٹ کلنگ میں شدت لاچکے ہیں پاکستانی ڈیتھ اسکواڈز کے درندگی کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں قابض فوج کی دہشتگردانہ کاروائیاں بھی جاری ہیں اسی اثناء میں گزشتہ روزڈیرہ بگٹی کے

علاقے شاہ کوہ سمیت گرد ونواح کے پہاڑی علاقوں پر پاکستانی گن شپ ہیلی کاپٹروں سے سیلنگ اور بمباری کی گئی جس سے ان علاقوں میں مالی و جانی نقصانات کے اطلاعات ہیں ترجمان نے کہا کہ دنیا میں قابض سامراجوں نے عوام کی جدوجہد کا رستہ روکھنے کیلئے ڈیتھ اسکواڈز بنا کر مظلوموں کے قتل عام کا حربہ استعمال کیا ہے اور مقامی دلالوں اور جرائم پیشہ عناصروں کی پرورش کر کے انہیں مظلوم اقوام کے خلاف استعمال کیا ہے پاکستان بھی اپنی قبضہ گیریت کو بچانے کیلئے سامراجی آقاہوں کے انہی نسل کشی کے حربے کو آزما رہا ہے اور مقامی دلالوں منشیات فروشوں سمیت تمام سماج دشمن عناصر کو اکھٹا کر کے انہیں بلوچستان بھر میں قتل عام کیلئے کھلی چھوٹ دی ہے تاکہ وہ تحریک آزادی کی بڑتی ہوئی مقبولیت کا راستہ روکھ سکیں لیکن جس طرح بنگلہ دیش میں پاکستانی بربریت کے حربے عوام میں جدوجہد کے عزم کو ختم نہ کر پائیں اسی طرح بلوچ قوم کی جدوجہد بھی ظلم کی ہر شکل کا سامنہ کر کے آزادی کی منزل تک پہنچے گی۔

‹‹

تاریخ:6نومبر 2013

خضدار میں ڈیتھ اسکواڈ کی درندگی جاری شہید ہارون زہری کے والد حاجی عبدلروف کو شہید کر دیا گیا۔بی ایس او آزاد

یکم نومبر کو ایک اور رشتہ دار کمسن وسیم زہری کو شہید کیا گیا۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ خضدار میں پاکستانی ڈیتھ اسکواڈ کے کاندوں نے فائرنگ کر کے بی ایس او آزاد کے کارکن شہید ہارون زہری کے والد 60 سالہ حاجی عبدالروف زہری کو شہید کر دیا بزرگ حاجی عبدلروف کی شہادت خضدار میں بلوچ کش ڈیتھ اسکواڈ کے درندگی کا تسلسل ہے یکم نومبر کو مختلف واقعات میں میر علی نواز مینگل اور شہید ہارون کے ایک اور رشتہ دار کمسن وسیم زہری کو فائرنگ کر کے شہید کر دیا گیا تھا اس سے قبل سوراب میں شہید زکریہ زہری کے کمسن رشتہ داروں رفیق اور نثار احمد کو شہید کر دیا گیا تھا پاکستانی زرخرید ڈیتھ اسکواڈ نے خضدار سمیت بلوچستان بھر میں اپنی درندگی اور وحشت کی مثالیں قائم کی ہیں اس کے قبل بھی ڈیتھ اسکواڈ کے زرخرید کارندے شہدا کے خاندان کے بچوں بزرگوں اور عورتوں کو اپنی سفاکیت کا نشانہ بناتے ہوئے شہید کر چکے ہیں خضدار ہی میں پاکستانی ڈیتھ اسکواڈ نے شہید سمیع مینگل کے سفید ریش والد حافظ عبدلقادر اور شہید مجید زہری کے والد حاجی رمضان زہری کو شہید کر دیا تھا ترجمان نے مزید کہا کہ 5 نومبر کو حب چوکی میں ساکران ہوٹل کے قریب سے ایف سی کی 7 گاڈیوں میں سوار اہلکاروں نے دینارند کو اغواء کر لیا پاکستانی فوج اور اس کے قاتل گروہ بلوچ نسل کشی میں شب وروز ایک کیئے ہوئے ہیں لیکن بلوچ فرزندوں نے قربانیوں کے جس کاروان کا آغاز کر دیا ہے وہ آزادی کی منزل حاصل کرنے تک ظلم و جبر کے سامنے نہیں رکھے گی پاکستانی ڈیتھ اسکواڈ کی سفاکانہ کاروائیوں میں حالیہ شدت سے ان کی شکست خوردگی واضح ہے ان زرخرید گروہوں نے تحریک آزادی کو ختم کرنے کیلئے ہزاروں بلوچ فرزندوں کو اغواء اور شہید کر کے ان کی مسخ شدہ لاشیں پھینک دی لیکن آج تک تحریک آزادی کی شدت کو کم نہ کر پائے اور اب اسی شکست خوردگی اور ہیجان کی کیفیت میں شہداء کے اہل خانہ کمسن بچوں اور بزرگوں کو شہید کر رہے پاکستانی قبضہ گیر کے خلاف جدوجہد آزادی میں بلوچ قوم اب تک ہزاروں کمسن نوجوان و بزرگوں کی قربانیاں دے چکی ہے اور ان ہی قربانیوں کے بدولت ہی بلوچ قوم میں جدوجہد کا عزم پختہ ہو چکا ہے جس کی واضع مثال ماما قدیر اور ان کے ساتھیوں کو کاروان ہے جو کہ پاکستان اور اس کے زرخرید ڈیتھ اسکواڈ کے جبر اور سفاکیت کی پروا کیئے بغیر اپنے حق اور آزادی کیلئے منزل کی جانب گامزن ہے۔

‹‹

تاریخ:7نومبر 2013

پنجگور میں بلوچ رہنما اور شاعر قاسم وفا کو شہد کر دیا گیا۔بی ایس او آزاد

ڈنمارک کی پاکستان کو امداد تشویش ناک ہے عالمی امداد بلوچ نسل کشی کیلئے استعمال ہو رہے ہیں۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ پنجگور میں قابض فوج کے کارندوں نے فائرنگ کر کے بی این ایم پنجگور کے کونسلر اور ضلعی آرگنائزر اور بلوچی شاعر قاسم وفا ولد حاجی نذیر احمد کو شہید کر دیا قاسم وفا اپنے بھائی کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھر سے چتکان بازار جا رہے تھے جنہیں رستے میں شاہو کہن کے مقام پر فائرنگ کر کے شہید کر دیا گیا شہید قاسم وفا تحریک آزادی میں سیاسی اور ادبی کردار ہمیشہ یاد رکھا جائیگا پاکستانی

فوج کی دہشتگردانہ کاروائیوں کا تسلسل ڈیرہ بگٹی اورنصیر آباد کے علاقوں میں شدت کے ساتھ جاری ہیں گزشتہ روز زین کوہ کے درمیانی علاقوں کے آبادیوں پر 9 مارٹر گولے داغے گئے جس سے ہلاکتوں کی اطلاعات ہیں جبکہ 6 افراد شدید زخمی ہوئے جن میں 2 بچے 1 خاتون شامل ہیں اسی اثناء میں گزشتہ شب نصیر آباد کے علاقے کناری اور بیلن میں قابض فوج نے گھروں کو محاصرے میں لیکر لوٹ مار کے بعد آگ لگادی اور لال محمد بگٹی اور خیر بخش بگٹی کو شدید تشدد کرنے کے بعد ر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئیں ترجمان نے مزید کہا کہ ڈنمارک کی جانب سے پاکستان کو ترقیاتی پروگرام کے نام پر 50 ملین ڈالر امداد تشویش ناک ہے پاکستان جیسے دہشتگرد ملک کو امداد دینا خطے میں عالمی امن سمیت مظلوم اقوام کے خلاف پاکستان کے عالمی جرائم اور دہشتگردانہ کاروائیوں میں معاونت کے مترادف ہے پاکستان بلوچ نسل کشی میں مصروف ہے اور بلوچستان بھر میں دہشتگرد فوج اور زرخرید کارندوں کے زریعے قتل وغارتگری کا بازار گرم کیئے ہوئے ہے پاکستان دنیا کے سامنے امن وامان کو جواز بنا کر بلوچ نسل کشی اور دہشتگردانہ کاروائیوں کو شدید کرنے کیلئے عالمی امداد حاصل کررہا ہے عالمی اداروں کی رپورٹیں ، پاکستانی ریاست کی جانب سے دہشتگردی کی پرورش اور عالمی جنگی قوانین سمیت انسانی حقوق کی شدید پامالیوں سے واضع ہے کہ پاکستانی ریاستی مشینری کو ملنے والی امریکی امداد عالمی مالیاتی اداروں کی قرضے سمیت ترقی وامن وامان کے نام پر ملنے والے ہر طرح کی امداد پاکستان کی انہی دہشتگردانہ عزائم کو پوراہ کرنے میں ہی استعمال ہونگے امریکہ ڈنمارک سمیت تمام عالمی ممالک اور امدادی ادارے پاکستان کی امداد عالمی قوانین کی عملداری سے منصوب کرکے پاکستان کی امداد روکھ دیں ڈنمارک کی جانب سے حالیہ امداد اور امریکہ کی جانب سے پاکستان کی روکھی ہوئی امداد کی بحالی سے پاکستان بلوچ نسل کشی سمیت خطے میں اپنے سرپرستی میں چلنے والے دہشتگردی کو مزید تیز کردیگا جس سے اس خطے میں جاری انسانی حقوق اور عالمی قوانین کی پامالی میں امریکہ اور ڈنمارک برائے راست شریک جرم ٹھہرتے اپنے عالمی امن اور انسانی حقوق کے دعوں کی پاسداری کرتے ہوئے عالمی ممالک پاکستان کی امداد منسوخ کردیں اور پاکستان کے خلاف عالمی قوانین کے مطابق کاروائی کرکے خطے میں امن وانصاب اور عالمی قوانین کی عملداری کو ممکن بنانے میں کردار ادا کریں۔

تاریخ: 8 نومبر 2013

ڈیرہ بگٹی ، نصیر آباد، مند، تربت میں قابض فوج کی دہشتگردانہ کاروائیاں جاری ہیں۔ بی ایس او آزاد

ڈیرہ بگٹی میں 2 بلوچ شہید، نیمرغ سے باقر بلوچ اغواہ، تربت اور مند میں گھروں پر حملہ کیا گیا

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ قابض فوج کی دہشتگردانہ کاروائیاں ڈیرہ بگٹی، نصیر آباد، مند، تربت سمیت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں شدت کے ساتھ جاری ہیں گزشتہ روز سے ڈیرہ بگٹی اور نصیر آباد میں شروع کیئے گئے دہشتگردانہ آپریشن کے دوران ڈیرہ بگٹی کے علاقے مٹ میں شمبو بگٹی اور گولہ بگٹی کو شہید کردیا گیا جبکہ نصیر آباد چتر میں قابض فورسز نے 2 سندھیوں کو اغواہ کرلیا ڈیرہ بگٹی اور نصیر آباد کے مختلف علاقوں سے اب تک متعدد افراد کے اغواء اور شہادتوں کی اطلاعات ہیں دہشتگردانہ کاروائیوں کے اسی تسلسل میں گزشتہ روز مند کے علاقے مہیر میں قابض فورسز نے گھر پر حملہ کرکے عورتوں اور بچوں سمیت گھر میں موجود افراد کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور 5 افراد کو اغواء کرکے اپنے ساتھ لے گئے جن میں سے 4 کو بعد میں چھوڑ دیا گیا جبکہ ایک تاحال قابض فوج کی حراست میں ہے فوج نے گھر میں لوٹ مار کرکے 4 موٹر سائیکل، 2 گاڑیاں اور زیورات سمیت تمام قیمتی اشیاء اپنے ساتھ لے گئے اسی اثناء میں گزشتہ رات تربت کے علاقے ڈنک میں قابض فورسز نے احمد جان کے گھر پر ایک مرتبہ پھر حملہ کرکے احمد جان کے بیٹے ولید بلوچ کو اغواء کرنے کی ناکام کوشش کی اس سے قبل بھی احمد جان کے گھر پر قابض فوج حملہ کرچکی ہے فوج نے گھر میں لوٹ مار کرکے تمام موبائل فونز اور قیمتی اشیا اپنے ساتھ لے گئے گزشتہ مہینے بھی ولید بلوچ پر حملہ کیا گیا تھا جس میں وہ زخمی ہوگئے تھے بلوچ فرزندوں کے اغواء کے تسلسل میں گزشتہ روز قلات کے علاقے نیمرغ میں 16 سالہ باقر بلوچ کو قابض فوج کے کارندوں نے مسافر گاڑی سے اتار کر اغواء کر لیا ترجمان نے مزید کہا کہ قابض فوج کی بلوچستان بھر میں درندگی میں روز بروز شدت آتی جارہی ہے لیکن عالمی ادارے قابض فوج کی جارحیت پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیئے ہوئے ہیں جو کہ تشویش ناک امر ہے عالمی اداروں کو پاکستان کی دہشتگردانہ کاروائیوں کا نوٹس لیں

تاریخ:9نومبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ مندمھیر میں قابض فوج کے ہاتھوں اغواء کمسن عزت بلوچ ولد تنگی کو شہید کردیا گیا8 نومبر کو مھیر میں قابض فورسز نے ایک گھر پر حملہ کرکے 5افراد کو اغواء کیا تھا جن میں سے 4 کو بعد میں چھوڑ دیا گیا جبکہ عزت بلوچ ولد تنگی کو قابض فوج نے شہید کرکے ان کی لاش لیویز کے حوالے کردی گزشتہ روز مرکزی ترجمان کی جانب سے تربت کے علاقے ڈنک میں احمد جان کے گھر پر فورسز کے حملے کی مزمت کی گئی تھی جس کی وضاعت کرتے ہوئے مرکزی ترجمان نے کہا کہ ڈنک میں ولید ولد احمد جان خود کو بی ایس او آزاد کا ممبر ظاہر کررہا ہے ولید بلوچ کا بی ایس او آزاد سے کوئی تعلق نہیں مرکزی ترجمان نے مزید کہا کہ پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کا آواران دورہ اور بلند وبانگ دعوے پاکستانی قبضہ گیریت کے شکست کو نہیں روکھ سکتے بلوچ قوم کی شعوری جدوجہد آزادی کو ناراضگی ومعرومیوں کا نام دے کر پاکستان اور اس کے گماشتوں نے ہمیشہ بلوچستان میں پاکستان کی قبضہ گیر حیثیت کو چھپانے کی کوشش کی نواز شریف بھی اپنے فوج کی درندگی اور اس کے خلاف بلوچ عوام کی جدوجہد آزادی سے انکار کرتے ہوئے امن ترقی اور مزاکرات کو گھسا پٹا راگ الاپ رہے ہیں ترقی کے جن دعوں کو پاکستانی ریاست تاحال اپنے دارلحکومت میں حقیقت نہ بناسکی نواز شریف ان سے بڑھ کر دعوے آواران میں کر گئے ہیں زلزلہ کو موقع غنیمت جان کر آوارن میں جہاں قومی جد وجہد آزادی نے پاکستانی قبضہ گیریت کو شکست دے دچار کردیا ہے پاکستان تعمیر و ترقی کے نام پر اپنی قبضہ گیر ریاستی مشینری کو مضبوط کرنے کی کوششیں کررہا ہے لیکن پاکستان کے ان پر فریب دعوں کی حقیقت قومی جدوجہد نے پہلے ہی واضع کردی ہیں بلوچستان میں ڈاکٹر مالک کی ڈمی حکومت اور اختر مینگل کی جانب سے قابض سے شکوے شکایتیں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں بلوچ عوام نے 11 مئی کے پاکستانی الیکشن میں دنیا کے سامنے یہ واضع کردیا کہ بلوچ اب بجلی گیس روڈ اور نالیوں کیلیئے بکنے والے نہیں ہیں اور بلوچستان میں حکومت اور عوامی نمائندگی کے دعوے درحقیقت پاکستانی فوج و ایجنسیوں کی جانب سے دنیا کو گمراہ کرنے کیلیئے ہیں تا کہ بلوچ قوم کی حقیقی آواز اور نمائندگی کو چھپا سکیں آواران سمیت بلوچستان بھر میں گزشتہ 6 دہائیوں سے بلوچ قوم پاکستانی قابض ریاست کی ننگی جارحیت کا مظاہرہ کررہی ہے مزاکرات ترقی اور امن کے دعوں اور زلزلہ سے تباہ حال لوگوں میں نام نہاد امدادی سرگرمیوں سے بلوچ قوم پاکستانی کی مسخ شدہ شکل اور قابض فوج کی درندگی کے تجربات کو کبھی نہیں بھولے گی بلوچ نسل کشی میں مصروف پاکستان کے ہر حربے کا مقصد بلوچ قوم کی آواز کو ہمیشہ کیلیئے دبا کر بلوچ سرزمین پر اپنے دہائیوں سے جاری قبضہ گیریت اور استحصال کو برقرار رکھنا ہے آج بلوچ قوم نے جس شعور و انقلابی سوچ وفکر سے جدوجہد آزادی کو مضبوط مقام پر پہنچایا ہے اس کے سامنے پاکستانی شاطر حربے ناکامی کا شکار ہونگے بلوچستان میں خوشحالی اور امن بلوچ قوم کی آزادی اور بلوچستان سے پاکستانی قبضہ گیریت سمیت سامراجیت کے تمام شکلوں کے خاتمے سے ہی ممکن ہے۔

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•››››››››››››››››››››››

تاریخ:12نومبر 2013

یوم شہدائے آزادی جد و جہد اور قربانی کے عزم کے ساتھ منائی جائیگی تمام زون پروگرام منعقد کریں۔بی ایس او آزاد

سوئی ،جعفر آباد، مشکے میں قابض فوج کی کاروئیاں جاری ہیں پنجگور سے پیرداد بلوچ کو اغواء کیا گیا

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں قابض فوج کے ہاتھوں بلوچ نسل کشی کی کاروائیاں شدت کے ساتھ جاری ہیں گزشتہ روز سوئی کے علاقے گوپٹ میں قابض فوج گھروں پر حملہ کرکے عورتوں اور بچوں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور 6بلوچوں کو اغواء کرکے اپنے ساتھ لے گئے اسی اثناء میں 11 نومبر کو قابض فوج نے صوبت پور کے گاؤں بھورل کھوسہ پر یلغار کرکے لوٹ مار کے بعد متعدد گھروں کو نظر آتش کردیا اور عورتوں بچوں اور بزرگوں کو غیر انسانی تشدد کا نشانہ بننے کے بعد 2 بلوچوں غلام محمد کھوسہ اور علی داد بگٹی کو آنکھوں پر پٹی باندکر اپنے ساتھ لے گئے جبکہ مشکے کے زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں قابض فوج کی جارحیت کے تسلسل میں گزشتہ روز مشکے گجر کے گاوں بندل میں قابض فوج نے حاجی محمد حسین قومی کے گھر کے دروازے تھوڑ دیئے اور گھر پر قبضہ کرکے اسے چوکی میں تبدیل کردیا10 نومبر کو پنجگور کے علاقے گرمکان سے قابض فوج نے پیرداد ولد اللہ بخش کو اغواہ کرلیا تھا جو کہ تاحال فوج کے حراست میں ہے پاکستانی فوج شدت کے ساتھ بلوچ آبادیوں پر حملہ کرکے بلوچ فرزندوں کو اغواء اور شہید کررہا

ہے لیکن نسل کشی کی کاروائیوں میں شدت بلوچ عوام کی تحریک آزادی کے ساتھ وابستگی کو کمزور نہیں کرسکتا ترجمان نے مزید کہا کہ 13 نومبر کو بلوچ قوم انتہائی جزبے اور شہدائے آزادی کے ساتھ عقیدت سے منائے گی 13 نومبر کا تاریخی دن ہم سے شہداء کی عظیم قربانیوں کو یاد کرنے اوران کے نظریہ پر عمل پیراہ ہو کر اپنی قوم کو آزادی کی روشن منزل تک لے جانے کا تقاضہ کرتا ہے بلوچ قوم کے باشعور فرزندوں نے غلامی کے ہر دور میں اپنی آزادی وقومی پہچان کی بقاء کیلئے سامراج کے ظلم و جبر کا سامنے کیا اور اپنے تاریخی جدو جہد سے بلوچ قوم کو ظلم کی تاریکیوں میں آزادی کی روشن صبح پر یقین دلائی اپنے نظریہ پر کار بندر ہتے ہوئے دشمن کے ہاتھوں ازیتیں اور تکلیفیں برداشت کی اور آزادی وقومی بقاء کیلئے جد و جہد میں آخری سانس تک ثابت قدم رہتے ہوئے اپنی جان کی قربانیاں دیں آج ان ہزاروں شہداء کی جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کونصب العین بناتے ہوئے ہمارہ فرض بنتا ہے کہ قومی آزادی کی تحریک کو سامراجی قبضہ گیروں کی پیدا کردہ چیلنجز میں کامیابی سے ہمکنار کریں اور تحریک آزادی کی انقلابی بنیادوں کو مزید مضبوط بنا کر انقلابی بلوچ سماج کی تشکیل کیلئے جدوجہد کریں 13 نومبر کو مرکزی کال کے مطابق تمام زون شہدائے آزادی کی یاد میں بھر پور پروگرامز کا انعقاد کریں۔

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•››››››››››››››››››››››››

تاریخ:13 نومبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کال کی مناسبت سے 13 نومبر یوم شہدائے آزادی تمام زونوں میں بھر پور انداز میں منائی گئی شہداء کی یاد میں منعقدہ ریفرنسز اور عوامی اجتماعات میں بلوچ عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کر کے شہداء کے قربانیوں کے ساتھ اپنے عزم کو دوہرایا مرکزی کال کے مطابق کراچی گڈاپ حب اتھل کوئٹہ مستونگ منگوچر قلات سبی خاران آواران گشکور تربت ھیرونک ہوشاپ گورکوپ بالگتر سرگودہ سمیت مختلف علاقوں میں ریفرنسز اور عوامی اجتماعات کا انعقاد کیا گیا یوم شہدائے آزادی کے موقع پر منعقدہ پروگراموں میں رہنماوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بلوچ قومی تاریخ ہر دور میں قابضوں کے خلاف اور حق و آزادی کیلئے جدوجہد اور قربانیوں سے منور رہا ہے بلوچ قوم کے بہادر اور وطن دوست فرزندوں نے ہر دور میں ظلم و جبر اور قبضہ گیریت کے خلاف اپنے سرزمین کی آزادی اور بلوچیت کی بقاء کیلئے سروں کا نظرانہ پیش کر کے قومی تاریخ میں سنہری مثالیں قائم کی اور آج وہی قربانیاں بلوچ فرزندوں کی رہنماہ ہیں 13 نومبر کے تاریخی دن کے موقع پر ہزاروں شہداء کی جدوجہد اور قربانیوں کے اہمت اور قومی تحریک میں ان کے کردار کو یاد کر کے شہداء کے مقصد کے ساتھ اپنے وابستگی اور عزم کو دہرانا ہے اس روز آزادی کیلئے اپنے جانوں کا قربانی دینے والے ہزاروں معلوم و گمنام شہداء کو یاد کر کے ہم تمام شہداء کے قربانیوں کی اہمیت کے اہمیت کو اجاگر کرنا ہے انہی ہزاروں شہداء کی بے مثال جدوجہد اور قربانیوں کے بدولت ہی آج ہم ایک مضبوط تحریک کے وارث ہیں قوموں کی زندگی میں بہادر فرزند ہر دور میں حق کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جبر کے سامنے ڈٹے رہے اور اپنے جدوجہد سے آنے والے نسلوں کیلئے روشن راہیں کھولیں دریں اثناء مکران کے مختلف علاقوں میں یوم شہدائے آزادی کی مناسبت سے عوامی اجتماعات کا انعقاد کیا گیا بی ایس او آزاد تربت زون کی جانب سے شہدائے آزادی کی یاد میں مرکزی کال کی مناسبت سے ریفرنس منعقد کیا گیا جس میں ممبروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ریفرنس سے رہنماوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انگریزوں نے 13 نومبر 1939 کو بلوچستان پر فوج کشی کی جس کے خلاف خان مہراب خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور دشمن کو یہ باور کرایا کہ بلوچ اپنی مادر وطن کے لئے سروں کو قربان کر دیتا ہے مگر غلامی قبول نہیں کرتا شہرک زون کی جانب سے شاپک میں ایک عظیم الشان عوامی اجتماع منعقد کی گئی جس میں بڑی تعداد میں بلوچوں نے شرکت کی پروگرام کو اختتام پر ریلی نکالی گئی ھیرونک میں ریلی اور عوامی اجتماح منعقد کیا گیا جس میں بلوچ عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی تجابان گورکوپ اور بالگتر میں بھی عوامی اجتماعات منعقد کیئے گئے شہرک ہنکین کی جانب شہدائے بلوچستان کی یاد میں یوم شہدائے آزادی کے حوالے سے یک عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں رہنماوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم جن لوگوں کی یاد میں یہاں جمع ہیں انہوں نے اپنی زندگی کے تمام خواہشات بلوچ قوم کیلئے قربان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امر ہو گئے ہمیں شہداء کے فلر کو لیکر ان ہی کی طرح ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار رہنا چاہیے آج اگر ہماری غلامی طویل ہوتی جارہی ہے اور ہماری شہدا کی لسٹ بڑھتی جارہی ہے تو اسکی زمہ دار مفاد پرست ہیں جو شہداء کی قربانیوں کا پارلمنٹ میں جا کر سودا کر رہے ہیں جلسے میں بلوچ ماں، بہنوں سمیت لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور آخر میں ریلی نکالی گئی ریلی نے مارچ کرتے ہوئے شہید کچکول بہار اور شہید اکرم کے آخری

آرام گاہوں پر جا کر شہیدوں کو سلامی دی اسی مناسبت سے خاران زون کی جانب سے بھی عوامی اجتماع منعقد کیا گیا اور شہداء کی یاد میں اجتماع کے اختتام پر عوام نے فاتح خوانی کی اور لنگر تقسیم کیئے گئے دریں اثناء مرکزی کال کے مطابق آواران زون کے زیر اہتمام آواران کے مختلف مقامات پر عوامی اجتماعات کا انعقاد کیا گیا اجتماعات میں سینکڑوں مرد، خواتین بزرگوں سمیت بچوں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کر کے شہدائے بلوچستان کو زبردست خراج تحسین پیش کی گئی پروگرام کی ابتداء شہدائے بلوچستان کی یاد میں دومنٹ کی خاموشی سے ہوئی جس کے بعد شرکاء سے مرکزی کمیٹی کے ممبر اور زونل رہنماؤں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 13 نومبر 1839 کو خان بلوچ میر محراب خان نے انگریزوں سے لڑ کر جام شہادت نوش کی اسی دن سے لیکر آج تک بلوچ اپنی سرزمین ننگ ناموس کی خاطر قبضہ گیر عالمی دہشتگر د ریاست پاکستان کے ظلم و جبر کے خلاف برسر پیکار ہیں بلوچ شہداء نے جس عظیم مقصد کیلئے اپنی جانیں قربان کی ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے ہمیں قومی آزادی کے پروگرام کو ہر بلوچ گدان تک پہنچانا ہے تاریخ میں ہر وقت بلوچ قوم کے فرزندوں نے اپنی سرزمین کی دفاع میں سر جکانے سے سر کٹانے کو ترجیح دی ہے پاکستان کی نوآبادیاتی نظام اور غلامی کے خلاف جدوجہد میں شہداء کی قربانیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں شرکاء سے رہنماوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بلوچ شہداء کے وارث وہ نھیں جو بلوچ شہداء اور قومی آزادی کے خلاف دشمن کا ساتھ دیں بلکہ شہداء کے اصل وارث ماما قدیر اور دوسرے بلوچ ہیں جو کوئٹہ سے کراچی تک کے طویل پیدل لانگ مارچ کر رہی ہیں اختر مینگل، حاصل بزنجو، ڈاکٹر مالک اور ان کے ہمنواح سردار میر معتبر اور وہ بلوچ جو آزادی کی تحریک کے خلاف سرگرم ہیں وہ بلوچ تاریخ میں پہلے سے ہی قومی مجرم تصور کیئے جا چکے ہیں بلوچ فرزندوں نے شہادت کا عظیم رتبہ پا کر ہمیں یہ پیغام دیا کہ قومی آزادی جیسے عظیم مقصد کو پانے کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے بی ایس او آزاد سرگودھا کی جانب سے مرکزی کال کے مطابق شہدائے بلوچستان ڈے کے حوالے ایک ریفرنس کا انعقاد کیا گیا ریفرنس کی ابتداء شہداء کی یاد میں خاموشی اور راجی سوت سے ہوئی جس کے بعد رہنماوں نے خطاب کیا۔

تاریخ: 15 نومبر 2013

آواران میں لشکرے طیبہ کے دہشتگردوں کو تحریک آزادی کے خلاف سرگرم کیا گیا ہے۔ بی ایس او (آزاد)

ایف آئی ایف کے نام پر امدادی سرگرمیوں کے آڑھ میں لشکر کے دہشتگردوں کو مسلح کر کے علاقوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔

مارواڈ میں قابض فوج نے 40 بلوچوں کو اغواہ کرلیا۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان کی جانب سے جاری کردہ بیان میں کہا کہ گزشتہ روز مارواڑ میں قابض فوج نے آپریشن کر کے 40 بلوچ نوجوانوں کو اغواء کرلیا فوج نے گھروں میں گھس کر عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کی عورتوں بچوں اور بزرگوں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور گھروں میں لوٹ مار کے بعد آگ لگا دی جس سے متعدد گھر جل کر خاکستر ہو گئے فوج نے کئی گاڑیوں کو بھی آگ لگا دی اور کوئلہ کے متعدد ٹرکوں کو اپنے ساتھ لے گئے جبکہ بلوچ فرزندوں کے اغواء کے تسلسل میں گزشتہ روز نوشکی سے قابض فورسز نے ظہور احمد لانگو کو اغواء کرلیا ترجمان نے مزید کہا کہ پاکستان دہشتگر د گروہ لشکرے طیبہ کے ادارے فلاح انسانیت فاونڈیشن کے نام پر اپنے ایجنٹوں کو آواران کے مختلف علاقوں میں پھیلا چکا ہے اور مذہب کی آڑھ میں مدرسوں کو تحریک آزادی کے خلاف استعمال کرنے کی کوششیں کر رہا ہے زلزلے کے ابتدائی دنوں میں دیگر تمام امدادی اداروں کی ٹیموں کو روک کر صرف فلاح انسانیت فاونڈیشن کو متاثرہ علاقوں میں جانے دیا گیا جن کے زریعے تحریک آزادی کے خلاف اور جہادی سرگرمیوں کے حق میں چاکنگ اور پروپگنڈہ کیا گیا اور اب اپنے انہی ایجنٹوں کو مسلح کر کے تحریک آزادی کے خلاف سرگرم کیا گیا ہے لباچ، ڈلبیدی، زیارت ڈن، مالار اور گشکور سمیت آوران کے مختلف علاقوں میں لشکر طیبہ تعمیراتی پراجیکٹس کے نام پر دہشتگر دانہ سرگرمیوں کیلئے مراکز قائم کر رہا ہے جبکہ آواران میں ایجوکیشن اور میڈیکل کمپلیکس کے نام پر دہشتگر دی کا مرکز بھی بنایا جا رہا ہے جہاں سے آواران سمت بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں بھی جہاد کے نام پر تحریک آزادی کے خلاف سرگرمیوں کو تیز کیا جائیگا حافظ سعید کی سربراہی میں چلنے والی لشکرے طیبہ برائے راست پاکستانی فوج کا حصہ ہے فلاح انسانیت فاونڈیشن لشکرے طیبہ (جماعت الدعوی) کا نام نہاد فلاحی تنظیم ہے جس کا مقصد فلاحی کاموں کے زریعے لشکرے طیبہ اور پاکستانی فوج کے دہشتگر دانہ سرگرمیوں کو چھپانا ہے لشکرے طیبہ

جیسے دہشتگرد گروہوں کے زریعے پاکستانی فوج معصوم لوگوں کو مذہبی جنونیت کی جانب راغب کرکے اپنے دہشتگردانہ مقاصد حاصل کررہا ہے امریکہ کی جانب سے لشکرے طیبہ اور اس کے ذیلی ادارے فلاح انسانیت فاونڈیشن پر پابندی کے باوجود بھی بلوچستان کے زلزلہ متاثرہ علاقوں میں ان کی کھلے عام سرگرمیوں پر امریکہ سمیت دنیاء کی خاموشی تشویش ناک ہے لشکرے طیبہ کی بلوچستان میں شدت اختیار کرتی سرگرمیوں کے خلاف امریکہ اور عالمی ادارے کاروائی کریں۔

''

تارخ:17نومبر2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ پنجگور میں قابض فوج کی درندگی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے گزشتہ چندروز میں پنجگور کے مختلف علاقوں سے قابض فوج گھروں پر حملہ کر کے متعدد بلوچ فرزندوں کو اغواء کرچکی ہے گزشتہ روز صبح سویرے قابض فوج نے پنجگور کے علاقے گرمکان کو محاصرے میں لے کر متعدد گھروں پر حملہ کر دیا فوج کے اہلکاروں نے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ کی عورتوں بچوں سمیت دیگر افراد کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور تنویر ولد ارشاد، قندیل ولد شاہ محمد، یاسر بلوچ، اختر اور سہیل ولد بہار کو شدید تشدد کے بعد اغواء کر کے اپنے ساتھ لے گئے گرمکان میں چندروز قبل بھی فورسز نے گھروں پر حملہ کر کے متعدد لوگوں کو اغواء کیا تھا جو کہ تا حال فورسز کے تحویل میں ہیں 14 نومبر کو پنجگور کے علاقے ڈمب میں خدارحیم ولد محمد عمر کے گھر پر حملہ کر کے خدارحیم کو اغواء کیا گیا تھا جبکہ ایک روز قبل غریب آباد میں بھی ایک گھر پر حملہ کیا گیا قابض فوج کی دہشتگردانہ کاروائیوں کا تسلسل ڈیرہ بگٹی اور گرد ونواح میں بھی شدت کے ساتھ جاری ہے ڈیرہ بگٹی کے علاقوں زین کوہ تلی مٹ، موندانی پٹ، گوپٹ، زامردان، نیلغ، چھتر، سوئی سمیت گرد ونواح کے متعدد علاقوں میں 6 نومبر سے قابض فوج کی شروع کی گئی دہشتگردانہ کاروائی تا حال جاری ہے اب تک قابض فوج کے ہاتھوں 7 بلوچ شہید اور 30 اغواء ہو چکے ہیں فورسز نے تا حال متعدد علاقوں کو محاصرے میں رکھا ہوا ہے ترجمان نے کہا کہ پنجگور ڈیرہ بگٹی سمیت بلوچستان بھر میں جاری پاکستانی جارحیت میں قابض فوج کو مقامی گماشتوں کی مدد حاصل ہے جن کی رہنمائی میں قابض فوروج آبادیوں میں گھس کو بلوچ فرزندوں کو اغواء اور شہید کررہا ہے پاکستانی قابض پارلیمنٹ میں بیٹھے گماشتے قبضہ گیریت کے نمائندے ہیں جن کا مقصد دنیا اور بلوچ عوام کو گمراہ کرکے پاکستانی قبضہ گیریت کو بچانا ہے جس طرح پاکستانی فوج کی درندگی بلوچ عوام کو جدوجہد آزادی سے دور نہیں کر پائی ہے اسی طرح پاکستانی گماشتوں کا مکروہ کردار بھی جدو جہد آزادی کو کمزور نہیں کر پائیگا بلوچ عوام نے ان گماشتوں کو الیکشن کے وقت ہی مسترد کر کے تحریک آزادی سے اپنی وابستگی واضع کر دی ہے اقوام متحدہ سمیت عالمی ادارے بلوچستان بھر میں پاکستان کی ننگی جارحیت اور تمام عالمی قوانین کو پامال کر کے بلوچ نسل کشی میں شدت لانے کا نوٹس لیں اور بلوچستان میں عالمی قوانین پر عملدرآمد یقینی بنا کر قومی آزادی کی حمایت کریں۔

''

تاریخ:19نومبر2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد شال زون کا جنرل باڈی اجلاس زیرِ صدارت زونل صدر منعقد ہوا جسکے مہمانِ خاص اور اعزازی مہمانِ خاص مرکزی کمیٹی کے ممبران تھے اجلاس میں زونل کارکردگی رپورٹ، مرکزی سرکولر، سوال جواب، تنظیمی امور، تنقید برائے تعمیر، موجودہ سیاسی صورتحال اور آئندہ لائحہ عمل ایجنڈے زیرِ بحث تھے تمام ایجنڈوں پر سیر حاصل بحث کی گئی زونل صدر ،مہمانانِ خاص اور اجلاس کے دیگر شرکاء نے تنظیمی امور پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ جدوجہد کے اس کھٹن سفر میں ہمیں ہر ایک قدم پر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہوگا جب تک ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوگا اور ہم میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نھیں نبھائے تنظیمی کی مضبوطی اور قومی تحریک کی کامیابی خام خیالی ہے قومی تحریک کی مضبوطی کیلئے انقلابی و سائنسی بنیادوں پر استوار مضبوط سیاسی اداروں کی ضرورت ہے سیاسی صورتحال پر بحث کرتے ہوئے اجلاس کے شرکاء نے کہا کہ رواں سال 11 مئی کو اپنے پارلیمانی انتخابات کی ناکامی کے بعد پاکستان اب ایک اور حربہ بلدیاتی انتخابات کی صورت میں آزمانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے تا کہ اپنے گماشتوں کو نچلی سطح تک منظم کرے تا کہ بلوچ قومی تحریک کو پارلیمان پرستوں کے ذریعے کاؤنٹر کرنے میں مزید آسانی ہو اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر بلدیاتی انتخابات کو منعقد کرنے کی سعی میں پاکستان کا یہ نیا حربہ بھی گزشتہ حربوں کی طرح ناکام ہوگا اجلاس کے شرکاء نے مزید کہا کہ بلوچستان کے زلزلہ زدہ علاقوں میں امداد کی آڑ میں بڑی تعداد میں ریگولر آرمی کی

تعیناتی اور این جی اوز اور فلاحی تنظیموں کا لبادہ اوڑھے پاکستان کی تشکیل کردہ جہادی تنظیموں لشکر طیبہ و دیگر کے ان علاقوں میں بلوچ آزادی پسندوں کے اثر ورسوخ کو کم کرنے اور علاقے کے عوام کو امداد کے نام پر ورغلا کر دل ودماغ جیتنے کی پاکستانی اور اسکے شیطانی عزائم کا مقابلہ کرنا بلوچ آزادی پسندون کی ذمہ داری ہے کیونکہ پاکستان نے اپنے آرمی اور جدید ہتھیاروں کے ذریعے نہ صرف بلوچ آزادی پسندوں کا گھیرا کرکے عام عوام کا دل جیتنے کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے بلکہ اپنے پالے ہوئے جہادیوں کو مختلف فلاحی اداروں کا نام دیکر انہیں بلوچ نوجوانوں کا دھیان قومی تحریک آزادی سے ہٹا کر مختلف دہشگرد گروپوں میں بھرتی کرنے کا ٹاسک بھی دیا ہے جسکے تدارک کیلئے ہمیں کاؤنٹر پالیسی ترتیب دینی ہوگی آئندہ لائحہ عمل میں نئے زونل کابینہ دی گئی۔

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•››››››››››››››››››››››››

تاریخ:20 نومبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ پنجگور کے علاقے تسپ میں گزشتہ روز قابض فوج نے شہید یونس کے گھر پر حملہ کرکے ارباب حسین، شیر دل اور ظفر بلوچ کو اغواء کرلیا شہید ٹھیکدار یونس کے بھائی ارباب حسین کو بعد میں چھوڑ دیا گیا جبکہ دیگر تاحال قابض فوج کے حراست میں ہیں گھروں میں لوٹ مار کرکے توڑ پھوڑ کی گئی اور عورتوں بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اس سے قبل اسی سال مارچ میں قابض فوج نے شہید یونس کے گھر پر حملہ کرکے سعید بلوچ کو شہید کیا تھا پنجگور شہر میں گزشتہ ایک ہفتے سے قابض فوج کی درندگی شدت کے ساتھ جاری ہے جس میں اب تک گرمکان وشبود، تسپ، چتکان سمیت مختلف علاقوں میں قابض فوج نے گھروں پر حملہ کرکے 43 لوگوں کو اغواء کیا ہے فوج نے علاقوں کا محاصرہ کرکے مواصلات اور آمدورفت کے زرائع معطل کردیئے اور راہ چلتے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا ترجمان نے مزید کہا کہ گزشتہ روز پسنی میں عارف نور کو فائرنگ کرکے قتل کیا گیا تھا جسے میڈیا اور ان کے اہل خانہ کی جانب سے بی ایس او آزاد کا کارکن ظاہر کیا گیا ہے لیکن عارف نور کا بی ایس او آزاد سے کوئی تعلق نہیں ترجمان نے مزید کہا کہ بلوچستان میں قابض پاکستان کا جبر اپنی انتہاء کو پہنچ چکا ہے عالمی انسانی حقوق اور صحافتی ادارے تمامتر صورتحال سے آگاہی کے باوجود بھی مجرمانی خاموشی اختیار کیئے ہوئے ہیں پاکستانی میڈیا کا کردار ہمیشہ قبضہ گیر اداروں کے جبر کو چھپا کر پاکستانی قبضہ گیریت کو تقویت دینا رہا ہے لیکن عالمی میڈیا بھی بلوچستان میں قابض فوج کے ہاتھوں جاری بلوچ نسل کشی آبادیوں پر حملہ بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتوں سمت بلوچستان بھر میں عالمی انسانی حقوق اور جنگی قوانین کی پامالی پر خاموش ہیں گزشتہ روز عالمی یوم صحافت پر جب عالمی دنیا صحافیوں کے کردار اور ان کی قربانیوں کو خراج پیش کیا جارہا تھا تو بلوچستان میں قابض فوج پنجگور ڈیرہ بگٹی سوئی آواران سمیت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں دہشگردانہ کاروائیوں میں مصروف تھی جبکہ گزشتہ ایک مہینے سے وائس پار بلوچ مسنگ پرسنز کے زیراہتمام ماما قدیر اور ان کے ساتھیوں کا قافلہ قابض فوج کے ہاتھوں جبری اغواء کیئے گئے بلوچوں کی بازیابی کیلئے لانگ مارچ کررہے ہیں لیکن عالمی صحافتی ادارے اپنی پیشہ ورانہ فرائض سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے بلوچستان میں پاکستانی جبر کو نظرانداز کررہے ہیں۔

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•››››››››››››››››››››››››

تاریخ:22 نومبر 2013

وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی تاریخی لانگ مارچ عالمی اداروں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے۔

26 نومبر کو یوم تاسیس پر تمام زون تربیتی پروگرام منعقد کرینگے۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ آواران میں گزشتہ روز تیسری مرتبہ محمد جان بلوچ کے گھر پر قابض فوج نے حملہ کرکے عورتوں اور بچوں کے ساتھ بدسلوکی کی اور گھر میں موجود 10 سالہ بچے کو شدید تشدد کا نشانہ بنا کر زخمی کردیا فورسز گھر میں گھس کر 10 سالہ ظہور بلوچ کو شدید تشدد کا نشانہ بنا کر زخمی کردیا آوارن اور مشکے میں حالیہ زلزلے کے بعد 2 مرتبہ قابض فورسز محمد جان کے گھر پر حملہ کرچکے ہیں جس سے ان کا خاندان حب چوکی نقل مکانی پر مجبور ہوگیا تھا لیکن قابض فورسز نے حب چوکی میں بھی ان کے گھر پر حملہ کرکے ایک رشتہ دار سفر بلوچ کو اغواء کیا تھا جو کہ تاحال لاپتہ ہیں جبکہ گزشتہ روز پنجگور کے علاقے تسپ سے قابض فوج نے شہید ٹھیکدار یونس کے بھائی ارباب حسین کو اغواء کیا تھا گزشتہ روز ان کے بازیابی کی میڈیا میں غلط خبر نشر ہوئی تھی ارباب حسین تاحال فوج کی حراست میں ہے ترجمان

نے مزید کہا کہ پاکستانی فورسز کے ہاتھوں جبری اغواء ہو چکے بلوچوں کے اہلخانہ نے ماما قدیر کی سربراہی میں کوئٹہ سے کراچی تاریخی لانگ مارچ کر کے اپنے حق آزادی اور اپنے پیاروں کے جبری اغواء کے خلاف جدوجہد کی تاریخ رقم کر دی ہے جسے آئندہ نسلیں ہمیشہ سنہرے الفاظ میں یاد رکھیں گی وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی تاریخی لانگ مارچ بلوچ نسل کشی پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیئے دنیا کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے کوئٹہ سے کراچی کا پیدل سفر کر کے ماما قدیر نے بلوچ قوم سمیت قبضہ گیریت اور سامراج کے ظلم کے شکار مظلوم اقوام کو جدوجہد کا درس دیا کہ قابض جارحین کا ظلم کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو وہ مظلوم اقوام کو اپنے آزادی اور انسانی حقوق سے دست بردار نہیں کر سکتا ماما قدیر اور ان کے ساتھوں نے تسلسل کے ساتھ اپنے پیاروں کی بازیابی کیلئے جدوجہد جاری رکھا اور اپنی آواز عالمی انسانی حقوق کے اداروں اور عالمی میڈیا تک پہنچانے کیلئے احتجاج ریلی بھوک ہڑتال سمیت تمام طریقے آزمائے اور تاریخی لانگ مارچ کر کے کوئٹہ سے کراچی کا سفر پیدل طے کر لیا لیکن انسانی حقوق اور عالمی قوانین کا راگ الاپنے والے اداروں کی بے حسی تا حال قائم ہے عالمی اداروں کی یہ بے حسی بلوچ قوم کو اپنے آزادی اور جبری اغواء کیئے گئے فرزندوں کی بازیابی کی جدوجہد سے دوور نہیں کر سکتی ترجمان نے مزید کہا کہ بی ایس او کی 46 یوم تاسیس کی مناسبت سے 26 نومبر کو تمام زون تربیتی پروگرام کا انعقاد کرینگے مرکزی کال کی مناسبت سے یوم تاسیس کے روز تمام زون ورکشاپ سرکل اور مختلف تربیتی پروگرامز انعقاد کرینگے جن میں کارکنوں سمیت عام عوام کی بی ایس او کی تاریخ، انقلابی تنظیم کاری اور قومی تحریک میں بی ایس او آزاد کے کردار کے حوالے سے سرکل دی جائیگی۔

.....

25 نومبر 2013

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا ہے کہ قابض ریاست کے خفیہ اداروں نے بی ایس او (آزاد) کے کمسن ممبر مسلم ولد ماسٹر امام الدین کو شہید کر کے انکی مسخ شدہ لاش واشک کے علاقے سوراپ میں پھینک دی ہے 15 سالہ مسلم پنجگور گرمکان کے رہائشی اور نویں جماعت کے طالب علم تھے جنہیں 7 ماہ قبل خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے پنجگور کے علاقے وشبود سراڈک سے اغواء کیا تھا جو اپنے اہلخانہ کے ساتھ اپنے رشتہ داروں سے ملنے خضدار جارہے تھے جنہیں اور گزشتہ روز شہید کر کے لاش واشک کے علاقے سوراپ میں پھینک دی شہید مسلم بلوچ کم سنی میں ہی بی ایس او (آزاد) کا ممبر بن کر آزادی کے کاروان میں شامل ہوگئے تھے اور مخلصی کے ساتھ بی ایس او (آزاد) اور قومی تحریک کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے شہید مسلم نے سرزمین کی خاطر سر کی قربانی دیکر کمسن شہید وحید بالاچ، شہید مجید زہری اور بی ایس او (آزاد) کے دیگر کارکنان ولیڈران سمیت تمام بلوچ شہداء کی روایت کو زندہ رکھا ہے بی ایس او (آزاد) شہید مسلم بلوچ کو انکی جدوجہد اور قربانی پر سُرخ سلام پیش کرتے ہوئے دشمن پر یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ بی ایس او (آزاد) وہ بہتا چشمہ ہے جو مخلص کارکنان کی بے لوث جدوجہد اور سروں کی قربانیوں سے اپنے منزل کی جانب رواں دواں ہے دشمن کی اسطرح کی ننگی جارحیت بی ایس او (آزاد) اور قومی تحریک کے کاروان کو نہ پہلے روک پائی تھی اور نہ آئندہ اسے کامیابی نصیب ہوگی شہید مسلم بلوچ کی شہادت نے اقتدار اور نوٹوں کی خاطر پاکستان کی جی حضوری میں مصروف حاصل خان اور ڈاکٹر مالک کے اس جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کا پول کھول دیا ہے جو دنیا کو گمراہ کرنے اور لاپتہ افراد کے لواحقین کے لانگ مارچ کے اثرات کو کم کرنے کیلئے یہ شوشہ چھوڑتے نہیں تھکتے کہ مسخ شدہ لاشیں گرنا اب بند ہوگئی ہیں۔

.....

تاریخ: 26 نومبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کال کے مطابق بی ایس او کے 46 ویں یوم تاسیس کے مناسبت سے کراچی، کوئٹہ، قلات، مستنگ، منگچر، کردگاپ، سبی، خاران، سرگودھا، تمپ، تربت، بالگتر، شاہرک، ہوشاپ، گورکوپ، مند، آواران سمیت دیگر زونوں کے زیر اہتمام تربیتی پروگرامز اور ریفرنسز کا انعقاد کیا گیا جن میں بی ایس او آزاد کی تاریخ اور قومی تحریک آزادی میں تنظیم کاری کی اہمیت پر ممبران اور عوام کو آگائی دی گئی مرکزی کال پر آواران زون کے زیر اہتمام مختلف مقامات پر ریفرنسز اور عوامی اجتماعات کا انعقاد کیا گیا پروگرام میں ممبران سمیت سینکڑوں مرد خواتین سمیت بچوں اور بزرگوں نے شرکت کی رہنماؤں نے خطاب کرتے ہوئے بی ایس او کی چھیالیس سالہ تاریخ اور بلوچ قومی تحریک آزادی کے حوالے سے ممبران اور عوام کو آگاہی دی اور کہا کے بی ایس

اوا اپنے قیام سے لیکر آج تک بلوچ عوام اور خاص کر بلوچ نوجوانوں کو سیاسی شعور اور قومی غلامی کے خلاف درس دیتا چلا آرہا ہے اپنے انقلابی کردار کی وجہ سے بی ایس او پاکستان کے جبر اور پابندیوں کا سامنا کرچکا ہے بی ایس آزاد بلوچ سماج میں سیاسی بیداری پیدا کررہا ہے اور اپنے ممبران کی سیاسی ونظریاتی تربیت کررہا ہے بی ایس او آزاد کی عوامی حمایت کو دیکھ کر پاکستان نے بی ایس او آزاد پر پابندی لگائی ہے مگر بی ایس او آزاد قومی و بین الاقوامی سطح پر اپنی وجود کو منوا چکی ہے اور نہایت ہی بہترین حکمت عملی کے تحت اپنی شہدائے کے ارمانوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کرچکی ہے شہید حمید شہید فدا جان ،شہید سہراب مری ،شہید جاوید اختر ،شہید غلام محمد ،شہید شفیع ،شہید قمبر چاکر ،شہید الیاس نزر ،شہید کامریڈ قیوم ،شہید یاسر جان ،شہید سکندر ،شہید جنید ،شہید ہارون ،شہید مجید ،شہید بالاچ اور شہید مسلم امام ،شہید شے مرید سمیت سینکڑوں ممبران نے شہادت کا مرتبہ پاکر بی ایس او کو منظّم کیا ہے اور یہ ثابت کردیا کہ بی ایس او کے انقلابی جہد کار اپنی آخری سانس تک تنظیمی زمہ داریوں کو نبانے اور بلوچ سرزمین کی آزادی کی تحریک کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی جدوجہد سے دستبردار نہیں ہونگے یوم تاسیس کے حوالے سے منعقدہ ریفرنسز میں رہنماؤں نے بی ایس او کی چھیالیس سالہ تاریخ پر ممبران کو لیکچر دیئے

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•›››››››››››››››››››››››››

تاریخ:28 نومبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ نال اور گریشہ میں قابض فوج نے ڈیتھ اسکواڈ اور مقامی گماشتوں کے مدد سے لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہوا ہے دکانداروں سے زبرستی بھتہ لیا جارہا ہے اور عام لوگوں کو راہ چلتے روک کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے لوگوں کو اغواہ کر کے ان سے باری وصول کی جارہی ہے گزشتہ ایک ہفتے سے نال اور گریشہ میں قابض فوج اور مقامی گماشتوں کی درندگی جاری ہے 23 نومبر کو مقامی ڈیتھ اسکواڈ اور پاکستانی فوج کے اہلکاروں کی 35 گاڈیوں پر مشتمل نفری نے تحصیل نال گریشہ میں یلغار کر کے آبادی پر شدید فائرنگ کیا تھا اور عام لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور لوٹ مار کر کے گھروں سے زیورات اور قیمتی اشیاء سمیت کمبل اور قیمتی اشیاء اپنے ساتھ لے گئے تھے نال گریشہ میں جاری اس لوٹ مار اور اغواء برائے تاوان کی سرپرستی برائے راست پاکستانی گماشتے سردار اسلم اور حاصل بزنجو کررہے ہیں جنہوں نے پاکستان کی گماشتگی میں ہرحد پار کرتے ہوئے بلوچ عوام کیلئے علاقے میں رہائش ناممکن بنادی ہے پاکستان نے حاصل اور اسلم بزنجو جیسے گماشتوں کو اپنے قبضہ گیریت کے دفاع کیلئے تحریک آزادی کے خلاف کھڑا کیا ہے جن کا مقصد مراعات کی خاطر بلوچ عوام کا قتل عام کرنا ہے اورنہوں نے اپنے آقاؤں سے وفاداری نباتے ہوئے بلوچ عوام کے خلاف ہرحد پار کردی ہے پاکستانی گماشتے ایک جانب پارلیمنٹ میں بیٹھ کر تحریک آزادی کے خلاف جاری پاکستانی دہشتگردانہ کاروائیوں کو چھپارہے ہیں اور دنیا کے سامنے بلوچ عوام کی نمائندگی کا دعوی کر کے تحریک آزادی کو عالمی سطح پر کمزور کرنے کی کوشش کررہے ہیں پاکستان نے ڈاکٹر مالک حاصل بزنجو اور اختر مینگل جیسے گماشتوں کو منظّم انداز میں تحریک آزادی کیخلاف استعمال کیا ہے جس کے عوض انہیں مراعات سے نوازا گیا ہے اور ان گماشتوں نے بھی ہمیشہ پاکستان سے اپنے وفاداری کا ثبوط دیتے ہوئے بلوچ قوم کے خلاف جاری قبضہ گیر ظلم وستم میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں بلوچ عوام قابض فوج کے ساتھ ساتھ ان کی ڈیتھ اسکواڈز اور اسلم و حاصل بزنجو جیسے گماشتوں کے کردار بھی پہچان چکی ہے اور انہیں اپنے صفوں سے نکال باہر کر کے انہیں قابض فوج کے حصار میں پناہ لینے پر مجبور کردیا ہے قومی تحریک کے ساتھ بلوچ عوام کی مضبوط وابستگی قابض فوج اور اس کے گماشتوں کی شکست ہے جو اپنی شکست دیکھتے ہوئے اپنے درندگی میں شدت لاتے جارہے ہیں۔

‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹‹•›››››››››››››››››››››››››

☆☆☆